لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ امْرَأَةً [حدیث رسول]

"وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنا حکمران ایک عورت کو بنا لیا۔"

عورت کی سربراہی کا مسئلہ

اور

شبہات و مغالطات کا ایک جائزہ

تالیف و ترتیب

حافظ صلاح الدین یوسف

مدیر اعلیٰ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور

مشیر وفاقی شرعی عدالت، پاکستان

دار الدعوة السلفية

شیش محل روڈ ○ لاہور ۲

لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا أَمْرَهُمْ امْرَأَةً [حدیث رسول]

"وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے اپنا حکمران ایک عورت کو بنا لیا۔"

عورت کی سربراہی کا مسئلہ

اور

شبہات و مغالطات کا ایک جائزہ

تالیف و ترتیب

حافظ صلاح الدین یوسف

مدیر اعلیٰ ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور

مشیر وفاقی شرعی عدالت، پاکستان

سلسلۂ اشاعت

(۳۴)

نام کتاب ——— عورت کی سربراہی کا مسئلہ

مصنف ——— حافظ صلاح الدین یوسف

تاریخ طبع ——— جمادی الثانیہ ۱۴۱۰ھ / جنوری ۱۹۹۰ء

ناشر ——— چوہدری محمد صدیق، مصطفےٰ آباد لاہور

دار الدعوۃ السلفیۃ

شیش محل روڈ ۔ لاہور

فون ۵۴۴۰۶

فہرست مضامین

حصہ دوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ مصنّف

پاکستان میں عام انتخابات کے نتیجے میں ایک عورت کا وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز ہو جانے کے اسباب (جنکی ہم وضاحت اس سے قبل ایک اداریئے میں کر چکے ہیں) بالکل واضح (۱) ہیں۔ تاہم اس کے باوجود یہ صورتِ حال اسلامی نقطۂ نظر سے سخت تشویشناک ہے۔ ہمارے نزدیک یہ سانحۂ الیمہ ایک فتنۂ کبریٰ اور مصیبتِ عظمیٰ ہے جس سے نجات کے لئے اللہ کی بارگاہ میں خصوصی دعائیں بھی کرنی چاہئیں اور اس صورتِ حال کو تبدیل کرنے کے لئے امکانی حد تک مساعی میں سرگرمِ عمل بھی رہنے کی ضرورت ہے۔

انہی مساعی میں ایک علمی محاذ بھی ہے جس پر اہل علم و اہل قلم کو بالخصوص اپنی توجہ مبذول رکھنی چاہیئے۔ یہ بات تو کسی سے مخفی نہیں کہ وہ اندرونی اور بیرونی طاقتیں جو اس ملک میں اسلامی تہذیب و تمدن کی برتری کی بجائے مغربی تہذیب کی بے ہودگیوں کا غلبہ چاہتی ہیں۔ وہ ایک عورت کے سربراہ بننے پر بڑی خوش ہیں کیونکہ وہ بجاطور پر یہ سمجھتی ہیں کہ اس کے ذریعے سے انہوں نے کم از کم عورت کے بارے میں قرآن و حدیث کے ایک مُسلّمہ اصول کو بری طرح پامال کرنے میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی ہے۔ اس لئے وہ اب اپنے گماشتوں، سیاسی آشفتہ سروں اور اشتراکی کوچہ گردوں کے ذریعے سے یہ کوشش کر رہی ہیں کہ عورت کی سربراہی کو سند جواز کا سہارا مہیا کر کے عورت کے مغربی تصور کو، جو اسلام کی عین ضد ہے، پاکستان میں مکمل طور پر فتح سے ہمکنار کر کے یہاں سے اسلام کے تصورِ حیاء و عفت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے۔

چنانچہ یہ مذکورہ عناصر اس "مہم" پر سرگرمِ عمل ہیں اور وہ مختلف انداز سے عورت کی سربراہی کے مسئلے کو بنیاد بنا کر قرآن و حدیث کی من مانی تاویلیں کر کے دین کو بازیچۂ اطفال بنانے اور مغرب کے نظریۂ مساواتِ مرد و زن کو عام کرنے کی مذموم سعی کر رہے ہیں۔ بنابریں اہل علم کا فرض ہے کہ وہ ان عناصر پر اور ان کی مسموم تحریروں

۱؎ ملاحظہ ہو ص ۹

پر کڑی نظر رکھیں ۔ اور جو زہر وہ پھیلا رہے ہیں، اس کا تریاق مہیا کریں، جو شکوک و شبہات وہ پیدا کر رہے ہیں، انہیں صاف کریں اور جو مغالطے وہ دے رہے ہیں ان کا ازالہ فرمائیں ۔

زیر نظر مضامین بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ، جس کا دائرہ ہم پھیلانے کی دعوت دے رہے ہیں اور اُس باطل پروپیگنڈے کا ایک توڑ ہے جو سیکولر اور مُلحد قسم کے لوگ کر رہے ہیں اور ان شبہات و مغالطات کے ازالے کی ایک کوشش ہے جو مذکورہ عناصر کی طرف سے پیش کئے جا رہے ہیں ۔

ان مضامین میں ہم نے عورت کے بارے میں اُس نقطۂ نظر کے اثباتی دلائل کی بالخصوص ضرورت دو وجہوں سے نہیں سمجھی، جو اسلام نے پیش کیا ہے ۔

ایک تو اس وجہ سے کہ مسلمان عورت کے دائرۂ عمل کا مسئلہ ۔ دو اور دو چار ۔ کی طرح بالکل واضح ہے ۔ اس میں کسی قسم کا خفاء اور پیچیدگی نہیں ہے ۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تنقیدی مضامین میں ضمناً ایک جگہ نہیں ، متعدد جگہ اس کے اہم دلائل آ گئے ہیں ۔

اس لئے یہ کتاب صرف اُن تنقیدی مضامین تک محدود ہے جو عورت کی سربراہی کے جواز کے جواب میں لکھے گئے ہیں ۔ امید ہے کہ انشاء اللہ ان مضامین سے مسئلے کے اہم گوشے واضح اور پھیلائے ہوئے شکوک و شبہات کی کُہر صاف ہو جائے گی ۔

ان مضامین میں کئی افراد کا جواب ہے ۔ پہلا حصہ روزنامہ "جنگ" کے مشہور کالم نویس ارشاد احمد حقانی کے جواب میں ہے یہ صاحب ایک طویل عرصہ جماعت اسلامی سے وابستہ اور مولانا مودودی صاحب کے خاصے قریب رہے لیکن جماعت سے نکلنے کے بعد غالباً ردِعمل کے طور پر کئی سال سے اس دوسرے کیمپ میں دادِ تحقیق دے رہے ہیں جو اسلام کے مقابلے میں دوسرے ازموں کا پرستار ہے ۔

ایک اور صاحب ہیں جو پیپلزپارٹی سے وابستہ ہیں ، انھوں نے ایک روز زبانی گفتگو میں فارس کی حکمران عورت، جس کی حکمرانی کی خبر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد "لن یفلح" فرمایا تھا، سرے سے اُس عورت کے وجود ہی کا انکار کیا ۔ چنانچہ دوسرے حصے میں اس حکمران عورت کا نام اور اس کا تاریخی ثبوت پیش کیا گیا ہے ۔

ایک استدلال فاطمہ جناح کی حمایت سے کیا جا رہا ہے، اس کی بھی اصل حقیقت اور

نوعیت واضح کی گئی ہے ۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک فتویٰ بھی اُچھالا جا رہا ہے، اس کا تجزیہ بھی پیش کیا گیا ہے ۔

ایک مضمون پروفیسر اسلم صاحب کا ہفت روزہ "ندا" لاہور میں شائع ہوا تھا جس میں بڑے مُتحدّیانہ انداز سے حدیثِ رسولؐ کو مشکوک بنانے کی مذموم سعی کی گئی تھی، راقم نے بتوفیق اللہ تعالیٰ اس کا بھرپور جواب دیا جو "ندا" میں شائع ہو چکا ہے ۔ اسے بھی اس مضمون میں شامل کر لیا گیا ہے ۔ اس کے علاوہ بھی دیگر بعض شبہات و مغالطات کا ازالہ اس کتاب میں کیا گیا ہے جو قارئین کرام آیندہ صفحات میں ملاحظہ فرمائیں گے ۔

ایک مضمون ادارہ کے ایک فاضل رفیق نعیم الحق نعیم صاحب کی کاوش فکر کا نتیجہ ہے جس میں انہوں نے اسلام اور مغربی جمہوریت کے تضاد کو نمایاں کر کے یہ واضح کیا ہے کہ ہمارے اہل سیاست اسلام اور جمہوریت کا ملغوبہ ملا کر جس شترگربگی کا مظاہرہ کر رہے ہیں، اس سے کبھی بھی ہم حقیقی امن و سکون اور کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتے ۔ بنابریں اگر ہم اس ملک کا تحفظ اور اس کا اسلامی تشخص برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم پوری یکسوئی اور اخلاص سے مغربی جمہوریت کی بجائے خالص اسلام کو اختیار کریں ۔

مذکورہ مضامین کے علاوہ بھی چند اور مضامین ہیں ان سب کا تعلق اسی موضوع خاص سے ہے جو زیر بحث ہے ان میں مضمون نگاروں کے ناموں کی صراحت کر دی گئی ہے اور جو بے نام ہیں وہ راقم کے قلم سے ہیں ۔ آخر میں ہم اہل خیر حضرات سے بھی اپیل کریں گے کہ وہ بھی اس موقعے پر اپنا کردار ادا کریں اور اس قسم کی چیزوں کو شائع کر کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچائیں ۔ وماعلینا الاالبلاغ المبین ۔

یہ سارے مضامین اس سے قبل ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور میں شائع ہو چکے ہیں، اب بہت سے احباب اور بزرگوں کی خواہش پر انہیں کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے ۔ واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم

صلاح الدین یوسف

دارالدعوۃ السلفیہ ۔ لاہور

ذوالحجہ ۱۴۰۹ھ جولائی ۱۹۸۹ء

۱۹۸۸ء کے انتخابی نتائج اور اہل دین کی ذمہ داری

ع اثر کرے نہ کرے سُن تو لے مری فریاد

ذیل کا مضمون ، جو انتخابی نتائج کے تجزیے پر مبنی ہے، بے نظیر کی حکومت بننے سے قبل تحریر کیا گیا تھا، کیونکہ اُس وقت تک کوئی بھی پارٹی اپنی اکثریت ثابت نہیں کر سکی تھی ۔ یہ مضمون اس لئے شامل اشاعت کیا جا رہا ہے کہ اس کی افادیت اب بھی باقی ہے اور اس میں اسمبلی کے آزاد اراکین اور چھوٹے گروپوں کو جس امر کی دعوت دی گئی تھی، جس کو نظرانداز کرنے کی وجہ سے ہی عورت کی سربراہی کا عذابِ الیم ہمیں برداشت کرنا پڑا ہے، اس کی اہمیت آج بھی برقرار ہے ۔

آزاد اراکین اور ایم کیو ایم سمیت تمام چھوٹے گروپس آج بھی اگر اسلامی اتحاد کے ساتھ آمادۂ تعاون ہو جائیں تو عورت کی سربراہی سے نجات مل سکتی ہے ۔ مضمون کی اسی افادیت کے پیش نظر اسے اس کتاب میں بھی شامل کیا جا رہا ہے ۔ اللہ کرے کہ یہ صدا پہلے تو صدا بہ صحراء ثابت ہوئی تھی، اب اس پر کچھ غور کیا جا سکے اور قومی اسمبلی کے ارکان اپنا اسلامی کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکیں (ص ۔ ی)

۱۶ نومبر ۱۹۸۸ء کو قومی اسمبلی کے انتخابات پُرامن ماحول میں بظاہر غیر جانبدارانہ طور پر منعقد ہوئے ۔ جس میں پیپلز پارٹی نے ۹۲ سیٹیں حاصل کر کے دوسری پارٹیوں کے مقابلے میں اکثریت حاصل کر لی ہے ۔

یہ نتیجہ بہت سے لوگوں کے نزدیک غیر متوقع ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیاسی شعور سے بہرہ ور لوگوں کے نزدیک یہ اتنا غیر متوقع نہیں ہے جتنا کہ سمجھا جا رہا ہے ۔

یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ پیپلزپارٹی کا مقابلہ کرنے کے لئے جس وسیع تر اتحاد، یکجہتی اور منظم انتخابی مہم کی ضرورت ہے چونکہ اس کا فقدان ہے اس لئے ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی تاریخ دُہرائی جائے گی جس میں پیپلز پارٹی نے ۳۴ فیصد ووٹ حاصل کر کے میدان مار لیا تھا اور ٦٦ فی صد اکثریت اپنے انتشار اور عدمِ اتحاد کی بنا پر کالعدم ہو کر رہ گئی تھی ۔

بالکل یہی صورتِ حال توقع کے عین مطابق، اب سامنے آئی ہے جس کے بہت سے اسباب ہیں ۔ مثلاً

۱ ۔ ایک تو یہی کہ پیپلزپارٹی کے مقابلے میں جس وسیع تر اتحاد کی ضرورت تھی وہ میسر نہیں آ سکا بالخصوص اسلامی اتحاد کے بالمقابل ایک اور "عوامی اتحاد" نے اسلامی اتحاد کی پیٹھ میں چُھرا گھونپ دینے کا ارتکاب کیا ۔

۲ ۔ اسلامی اتحاد میں شامل بعض جماعتوں کے افراد نے پارٹی ڈسپلن سے انحراف کر کے آزاد امیدواروں کے طور پر کھڑے ہو کر بھی پیپلز پارٹی کو زبردست تقویت پہنچائی ۔

۳ ۔ بعض حلقوں میں ان "مُنحرفین" کی وجہ سے آخر تک گو مگو اور تذبذب کی کیفیت رہی اور ایک دوسرے کے خلاف "اٹھنے بیٹھنے" کی افواہیں گشت کرتی رہیں جس کی وجہ سے کسی بھی امیدوار کی انتخابی مہم یکسوئی اور دل جمعی کے ساتھ نہیں چل سکی ۔ اور کارکن بددلی اور مایوسی کا شکار رہے ۔ اگر بعض جگہ کسی نے دست برداری بھی اختیار کی تو اُس آخری وقت میں کی جب "تیر" کمان سے نکل چکا تھا اور اس کا کوئی خاص فائدہ باقی نہیں رہ گیا تھا ۔

۴ ۔ یہ بھی تسلیم کرنا چاہیئے کہ کارکنوں میں وہ جوشِ عمل اور جذبہ بھی مفقود تھا جو اس کے مخالف گروپ کے کارکنوں میں نظر آتا تھا ۔ البتہ میاں نواز شریف اور قاضی حسین احمد کی انتخابی مہم اور جماعت اسلامی کے کارکنوں کی محنت اور جدوجہد نے کچھ لاج رکھ لی ورنہ شاید اس سے بھی زیادہ خوفناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ۔

۵ ۔ یہ بھی اعتراف کر لینا چاہیئے کہ جنرل ضیاء الحق کے گیارہ سالہ دورِ اقتدار کی "سزا" بھی اسلامی اتحاد ہی کو ملی ہے ۔ ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت کا جو عالم پیپلزپارٹی کے سات سالہ دور اقتدار میں رہا، جنرل ضیاء الحق کا دور اگرچہ اس کے مقابلے میں نہایت شرافت کا دور رہا لیکن اس دور میں بد قسمتی سے اندرون ملک عوام کو جن

مشکلات کا سامنا رہا کہ ایک طرف سندھ میں لسانی، علاقائی اور صوبائی تعصبات نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کئے رکھا، دوسری طرف منشیات اور ہیروئن کی وبا خاصی تیزی سے پھیلی اور تیسری طرف مہنگائی رشوت، لوٹ کھسوٹ اور اخلاقی ابتری اور بدامنی کا وہی حال رہا جو پہلے تھا بلکہ اخلاقی انحطاط کے ساتھ ساتھ ان تمام خرابیوں کا گراف بھی بلند ہی ہوا ۔ علاوہ ازیں "اسلامائزیشن" کی جتنی دھوم اخباری بیانات اور عوامی خطابات میں تھی، اس کی کوئی نمایاں جھلک بھی معاشرے میں اور قومی کردار میں نظر نہیں آتی تھی ، یوں ضیاء مرحوم بلاشبہ خارجہ پالیسی بالخصوص افغان پالیسی میں نہایت مومنانہ اور مجاہدانہ کردار ادا کرنے کے باوجود اندرون ملک اُس کمزور کردار سے مختلف کوئی رول ادا نہیں کر سکے جو ان کے پیش رو حکمرانوں کا بھی وطیرہ اور ان کے دورِ اقتدار کا بھی طرۂ امتیاز رہا۔ اس گیارہ سالہ دور اقتدار میں آخری تین سال چونکہ مسلم لیگ کے بھی شامل ہیں۔ اس لئے مسلم لیگ اور اس کے اتحادیوں کو بھی اس میں برابر کا شریک سمجھا گیا ۔ گویا بھٹو کا دور پس منظر میں چلے جانے کی وجہ سے جنرل ضیاء کے دور کی خرابیاں تازہ اور منظرعام پر رہیں جس سے پیپلزپارٹی نے خوب فائدہ اٹھایا ۔

٦ ۔ مخلوط تعلیم کے علاوہ ذرائع ابلاغ (بالخصوص ٹیلی ویژن) اور اخبارات نے مسلمان عورت کو بے پردہ کرنے اور اس کو اسلامی ستر و حجاب اور شرم و حیاء کے زیور سے محروم کرنے میں جو کردار ادا کیا ، وہ محتاجِ وضاحت نہیں ۔ جب مسلمان عورت پردے سے بے نیاز ہی نہ ہوبلکہ اس کے لئے آئیڈیل بھی حضرت خدیجہؓ ، حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کی بجائے فلمی اداکارائیں ہی ہوں تو اس معاشرے کی عورتوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ قاضی حسین، پروفیسر غفور جیسے لوگوں کو پسند کریں گی، خام خیالی ہی ہے ۔ اس لیے راقم کے خیال میں پاکستانی عورت کی ایک بڑی اکثریت، جو اب پردے سے بے نیاز ہو چکی ہے، قدرتی طور پر اس کی ہمدردیاں پیپلزپارٹی کے ساتھ ہی ہو سکتی ہیں ۔ ووٹروں کے اس نئے رجحان کو بھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔

٧ ۔ خالص مذہبی جماعتوں کا سیاسی گروپوں کی شکل اختیار کر لینے کا بھی موجودہ نتائج میں بڑا دخل ہے ۔ جس طرح کہ نورانی گروپ نے اصغر خاں کے ساتھ مل کر اسلامی اتحاد کو سخت نقصان پہنچایا ۔ فضل الرحمن گروپ آخر وقت تک پیپلز پارٹی کے ساتھ اتحاد میں کوشاں رہا ۔ اور اہلحدیث کے ایک گروپ نے، جو اپنے عوام میں سیاسی شعور

بیدار کرنے کا دعویدار ہے اپنی پالیسیوں سے پیپلزپارٹی کو تائید فراہم کی اور اس نے بعض جگہ اسلامی اتحاد کے مضبوط امیدواروں تک کو ہرا دینے کا کارنامہ انجام دے کر فی الواقع "سیاسی شعور" کا ناقابل تردید ثبوت مہیا کیا ہے ۔

۸ ۔ جنرل ضیاء کے دور میں سیاسی حلقوں کی طرف سے پیپلزپارٹی کی "مظلومیت" کا جو رونا رویا جاتا رہا، اگرچہ وہ ان کی ایک سیاسی مجبوری تھی تاہم اس سے بھی پیپلزپارٹی کو خوب فائدہ پہنچا ۔

۹ ۔ بھٹو صاحب کی موت عدالت عالیہ کے فیصلے کا نتیجہ تھی لیکن پیپلزپارٹی عوام کو یہ باور کرانے میں خاصی کامیاب رہی کہ انہوں نے عوام کی خاطر پھانسی کا پھندہ قبول کیا ہے ۔ اس لئے عوام نے "تب و تاب جاودانہ" کی صورت میں "صلۂ شہید" عطا کیا ۔

۱۰ ۔ غیر ملکی اخبارات نے بھی "بیگمات" کی مظلومیت اور ان کی شخصیت کو ابھارا ہے اور پھر اس کی جس طریقے سے ہمارے اخبارات میں اشاعت ہوئی ہے اس سے بھی پیپلز پارٹی کو بہت فائدہ پہنچا ہے ۔

تلک عشرۃ کاملۃ

بہرحال یہ چند موٹے موٹے اسباب ہیں جن کی وجہ سے قومی اسمبلی میں پیپلزپارٹی کو اسلامی اتحاد کے مقابلے میں زیادہ نشستیں ملی ہیں ۔ اور اس تفصیل سے مقصود یہ ہے کہ مذکورہ اسباب کو سامنے رکھتے ہوئے آئندہ کے لئے پیش دستی اور منصوبہ بندی کرنے کی شدید ضرورت ہے پیپلزپارٹی اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ جب تک مذکورہ عوامل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کا توڑ مہیا نہیں کیا جائے گا اس کا مقابلہ ممکن نہیں رہے گا ۔

صوبائی نتائج سے صورتِ حال میں تبدیلی

قومی اسمبلی کے نتائج کے بعد صوبائی اسمبلیوں کے نتائج نے البتہ پیپلزپارٹی کے بڑھتے ہوئے حوصلوں کو پست اور اسلامی اتحاد کی شکستہ خاطری کا کچھ ازالہ کیا ہے جو

خوش آیند بھی ہے اور کچھ خطرات بھی اپنے اندر لئے ہوئے ہے ۔

خُوش آیند اس اعتبار سے کہ اس سے اسلامی قوتوں کو یقیناً حوصلہ ملا ہے ، ان کے جذبوں کو توانائی اور ان کے افسردہ دلوں کو ولولۂ تازہ حاصل ہوا ہے ۔ لیکن اس میں خطرے کا پہلو یہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال میں حکومت سازی کا کام بحران کا شکار ہو سکتا ہے ۔ اگر صوبوں میں بھی پیپلزپارٹی کو اکثریت حاصل ہو جاتی تو پورے ملک میں اس کو حکومت کرنے کا موقع ملتا اور پیپلزپارٹی کے بہت سے مخالفین کی بھی یہ خواہش تھی کہ اسے حکومت کرنے کا موقعہ ملنا چاہیئے کیونکہ اس کے بغیر اس پارٹی کا وہ "سحر" نہیں ٹوٹے گا جو عوام کے ایک طبقے پر بری طرح قائم ہے ۔۔

بھرم کھل جائے ظالم تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پُر پیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

صوبائی نتائج نے، صورت حال میں خاصی تبدیلی کر دی ہے ، اس بارے میں سیاسی مبصرین بہت سی باتیں کر رہے ہیں ۔ تاہم یقین سے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کیا ہو گا؟ اس لئے فی الحال اس پر رائے زنی بھی مناسب معلوم نہیں ہوتی ۔ تاہم یہ دعاء ضرور ہے کہ یہ تمام مراحل خوش اسلوبی سے طے ہو جائیں اور ملک کسی نئی آفت اور بحران سے دوچار نہ ہو ۔

پیپلزپارٹی کی حیثیت

ایک دعویٰ یہ کیا جا رہا ہے کہ پیپلز پارٹی اکثریت کے ساتھ ایک وفاق کے طور پر اُبھر کر سامنے آئی ہے، اس لئے بلاتاخیر اس کو حکومت بنانے کا موقعہ دینا چاہیئے ۔

جہاں تک وفاق کی علامت ہونے کا تعلق ہے یہ بات اُس وقت صحیح ہوتی جب پیپلزپارٹی نے سندھ کی نشستیں بھی انھی بنیادوں پر جیتی ہوتیں جن بنیادوں پر اس نے دوسرے صوبوں میں کامیابی حاصل کی ہے ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ سندھ میں پیپلزپارٹی کا کردار ایک خالص سندھی جماعت سے مختلف نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں سارے ٹکٹ بھی سندھیوں کو ہی دیئے گئے تھے ۔ علاوہ ازیں محمد خان جونیجو، جتوئی اور وفاقی وزیر الٰہی بخش سومرو جیسے ذمہ داروں کے بیانات اخبارات میں آ چکے ہیں جن میں انھوں نے

واضح الفاظ میں کہا ہے کہ سندھ میں پیپلزپارٹی نے سندھی قومیت کے نعرے پر انتخابات میں کامیابی حاصل کی ہے اور سندھ میں اس کا انداز سیاست ایم کیو ایم سے ملتا جلتا رہا ہے ۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سندھ میں اسلامی جمہوری اتحاد کے خلاف ایک منظم سازش ہوئی ہے اور ہر جگہ بڑے پیمانے پر دھاندلی کی گئی ہے جس میں پولنگ عملہ اور انتظامیہ پوری طرح ملوّث ہے جب صورتِ حال یہ ہے تو اسے کس طرح خوش آئند یا علامتِ وفاق قرار دیا جا سکتا ہے؟

اس پس منظر میں تو سندھ میں صرف پیپلزپارٹی ہی کی کامیابی زیادہ تشویشناک نظر آتی ہے ۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ سندھ کے متعصب سندھی عناصر نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے پیپلزپارٹی کے پلیٹ فارم کو استعمال کرنے کا اسی طرح منصوبہ بنا لیا ہو جس طرح پہلے اسی پلیٹ فارم کو جناب بھٹو کے دور میں سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں نے استعمال کیا، جس کا خمیازہ ملکی معیشت کو آج تک بھگتنا پڑ رہا ہے ۔ خدانخواستہ ایسا ہوا تو سندھ میں ایم کیو ایم اور سندھی مفادات کے لئے کام کرنے والے عناصر کے درمیان جو کش مکش اور دونوں کے مخصوص محدود مفادات کے مابین تصادم کی جو خطرناک صورت پیدا ہو سکتی ہے اس کا تصور بھی ملّی درد سے سرشار لوگوں کے لئے سخت اذیّت ناک ہے (۱)

جہاں تک پیپلز پارٹی کی اکثریت کا تعلق ہے، بلاشبہ قومی اسمبلی میں اُسے حاصل ہے لیکن حکومت سازی کے لئے جس واضح اکثریت کی ضرورت ہے، اُس سے وہ ابھی تک محروم ہے ۔ اس لئے جب تک کوئی پارٹی یا اتحاد اپنی واضح اکثریت ثابت نہیں کر دیتا ۔ اس وقت تک کسی کو بھی حکومت سونپ دینے کا مشورہ دینا صحیح نہیں ۔ ایسے تمام مشیران گرامی کو ابھی انتظار کرنا چاہیئے اگر فی الواقع پیپلزپارٹی اپنی اکثریت ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئی تو جمہوری تماشے کی رُو سے اُسے ہی حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی۔

---

(۱) یہ اندیشہ ، جو اُس وقت ظاہر کیا گیا تھا، اب حقیقت بن کر سامنے آگیا ہے اور اس سے ان حضرات کی سیاسی "بصیرت" بھی طشت از بام ہو جاتی ہے جو پیپلز پارٹی کو "وفاق کی علامت" باور کرا رہے تھے ۔

علمائے دین اور داعیانِ اسلام کی ذمّہ داری

تاہم اس موقعے پر مردان مومن اور داعیان اسلام اگر اپنے ملّی درد کی وجہ سے اخباری بیان دینا ضروری ہی سمجھتے ہوں تو انہیں یہ بیان دینا چاہیئے کہ اکثریتی حق کی بنا پر اگر پیپلزپارٹی کو حکومت بنانے کا موقع ملے تو اسے چاہیئے کہ وہ اپنی پارٹی کا سربراہ بے شک محترمہ بے نظیر ہی کو بنائے رکھے لیکن وزارت عظمیٰ (یعنی حکومت کی سربراہی) کے لئے اپنی پارٹی کے کسی موزوں مرد کا انتخاب کرے تاکہ اسلام کے واضح اصولوں کی بھی خلاف ورزی نہ ہو اور پاکستان کی اسلام کے حوالے سے جو شہرت ہے وہ بھی داغدار نہ ہو۔

یہ مشورہ پارٹی یا اس کی سربراہ کے لئے قابل قبول ہے یا نہیں؟ اس سے قطع نظر اگر بیان بازی کا شوق ہی پورا فرمانا ہو تو اس میں کم از کم علمائے دین اور داعیان اسلام کو اپنے منصب کی ذمّے داری اور اس کے تقاضوں کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

ہمارے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے فرمایا ہے کہ اگرچہ اسلام میں عورت کی سربراہی ناجائز ہی ہے تاہم جہاں اور برائیاں عام ہیں اور ہم انہیں برداشت کر رہے ہیں، وہاں اسے بھی برداشت کر لینا چاہیئے لیکن یہ دلیل ایسی ہی جیسے کسی شرابی کو کہا جائے، میاں تم شراب تو پیتے ہی ہو، رُوے دل آرام سے بھی دل بہلا لیا کرو۔ وعلیٰ ہذا القیاس۔ اگر ایک برائی دوسری برائی کے لئے وجہ جواز بن سکتی ہے تو پھر تو برائی کا سارا راستہ ہی چوپٹ کھل جاتا ہے۔ اس لئے ایک بزرگ عالم دین کی طرف سے یہ دلیل عجیب مضحکہ خیز ہے حالانکہ موٹی سی بات ہے کہ جو برائیاں حکومتی سطح پر عام ہیں (جیسے سود وغیرہ) وہ ہمارے دائرہ اختیار سے باہر ہیں اور ہم انہیں برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ ہمارے اختیار اور ارادے کا اس میں دخل نہیں ہے۔ اگر محترمہ بے نظیر وزیراعظم بن گئیں تو خواہی نخواہی ہمیں اُسے بھی برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن بُرائی مسلّط ہو جائے اور اسے برداشت کرنا پڑے تو اس کی حیثیت اور ہے اور ایک برائی کو دلیل بنا کر دوسری برائی کی ترغیب دینا یا اسے اختیار کرنے کا مشورہ دینا شئی دیگر ہے۔ اول الذکر اُمید ہے کہ بے اختیاری کی بنا پر قابل عفو بات ہو گی۔ جب کہ ثانی الذکر صورت میں وہ عنداللہ ایک قابل مؤاخذہ جُرم ہو سکتا ہے کیونکہ ایک برائی کی ترغیب اور

مشورے میں وہ بھی شریک ہو گیا ہے ۔

بنابریں علمائے دین کی یہ ذمّے داری ہے کہ وہ شریعت اسلامیہ کے مسلّمہ اصول وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (الاحزاب) (عورتیں گھروں کے اندر رہیں) اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کہ "وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہو گی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیئے" کو سامنے رکھتے ہوئے عورت کی سربراہی کے عدمِ جواز میں کسی لچک اور مداہنت کا ارتکاب کر کے

یہ ناداں گر گئے سجدے میں جب وقتِ قیام آیا

کا مظاہرہ نہ کریں ۔ انہیں اس بات کی قطعاً پروا نہیں ہونی چاہیئے کہ ہماری آواز حکومت کے ایوانوں، سیاست کے نگارخانوں اور عوام کے نقارخانوں میں نہیں سُنی جائے گی ۔ صرف عنداللہ مسئولیت کا احساس اور وہاں سُرخرو ہونے کا جذبہ ہی غالب رہنا چاہیئے ۔

آزاد اراکین قومی اسمبلی اور چھوٹے گروپوں کی اہمیت اور اس کا تقاضا

قومی اسمبلی میں باہم مخالف فریقوں میں سے کوئی بھی واضح اکثریت حاصل نہیں کر سکا ہے جس کی وجہ سے فی الحال کوئی بھی پارٹی یا اتحاد حکومت بنانے کی پوزیشن میں نہیں ہے ۔

اس کا ایک حل مخلوط حکومت ہے ۔ لیکن اس کو دونوں فریقوں نے ردّ کر دیا ہے ۔ نواز شریف اور بے نظیر دونوں کے بیانات سے واضح ہے کہ ان دونوں میں سے کوئی بھی اس کے لئے آمادہ نہیں ہے ۔ دونوں کے درمیان نظریات کا جو بُعد اور ذہنی ہم آہنگی کا جو فقدان ہے اس کے پیشِ نظر فی الواقع مخلوط حکومت کے امکانات بہت موہوم ہیں ۔

ایک تجویز قومی حکومت کی بھی ہے جو فی الواقع قابل عمل بھی ہے اور بحالاتِ موجودہ نہایت مفید بھی بلکہ راقم کے خیال میں ایک طویل عرصے تک قومی حکومت کے ذریعے ملک کا نظم و نسق چلایا جائے اور انتخابات کی بساط اس وقت تک کے لئے لپیٹ

دی جائے جب تک صحیح معنوں میں قوم کے اندر تعلیمی و سیاسی شعور پیدا نہ ہو جائے ۔ تو زیادہ بہتر ہے ۔ بحالات موجودہ جمہوری انتخابات ہمارے لئے سازگار نہیں ہیں، اس کی وجہ سے ملک ہمیشہ بحرانوں سے ہی دوچار رہا ہے اور آیندہ مستقبل قریب میں بھی بحرانوں کے سخت امکانات ہیں ۔ تاہم المیہ یہ ہے کہ سیاسی جماعتیں قومی حکومت کے قیام کی تجویز سے متفق نہیں ہیں سب اسی عطّار کے لونڈے سے دوا لینے پر مُصر ہیں، جس کے سبب وہ بیمار ہیں ۔

اب ایک ہی حل باقی رہ جاتا ہے اور سب کی توجہ اسی کی طرف مبذول ہے اور وہ ہے چھوٹے گروپس اور آزاد ارکان قومی اسمبلی کو اپنے ساتھ ملا کر حکومت بنانے کا ۔ فی الواقع اس وقت حکومت سازی کی ساری قوت انہی کے پاس ہے یہ اپنا وزن جس پلڑے میں بھی ڈال دیں گے وہ حکومت سازی کا حق حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا ۔ اس وقت دونوں فریق یہ دعوی کر رہے ہیں کہ آزاد ارکان یا ان کی اکثریت ہمارے ساتھ ہے ، اس لئے حکومت ہم بنائیں گے ۔ تاہم ابھی قطعیّت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ پروانے کس شمع کے گرد جمع ہونے کو ترجیح دیں گے ۔

آزاد اراکین اور چند نشستیں لینے والے سیاسی گروپوں کی یہ اہمیت اس بات کی متقاضی ہے کہ یہ اراکین اور گروپ فیصلہ کرتے وقت محدود اور ذاتی مفادات کے مقابلے میں ملک و ملّت کے وسیع تر مفادات کو سامنے رکھیں اور کسی بھی جماعت میں شمولیت سے قبل یہ سوچیں کہ ملک کی اساس ۔ اسلام ۔ کے قریب تر کون سی جماعت ہے؟ اور کس کے ذریعے سے یہ اساسی مقصد حاصل ہونے کا زیادہ امکان ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ گذشتہ چالیس سالہ دور میں اسلام کا نام تو بہت استعمال ہوا ہے لیکن عملًا اسلام کے نفاذ کا کام لگن اور خلوص دل سے کسی نے بھی نہیں کیا اس لئے اب اسلام کا نام بھی اپنی کشش کھو چکا ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیئے کہ یہ غلطی حکمرانوں اور برسراقتدار آنے والی جماعتوں کی ہے اسلام کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے ۔

اسلام تو آج بھی منتظر ہے کہ کاش اسے کوئی استعمال کرے تاکہ ملک و ملّت کو درپیش گھمبیر مسائل کا حل نکل سکے بنابریں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ آزاد اراکین اور چھوٹے گروپ اپنا وزن اسلام کے پلڑے میں ڈالیں اور پھر اس جماعت کو مجبور کریں کہ وہ ادوار گذشتہ کی طرح صرف اسلام کا لیبل ہی استعمال نہ کرے بلکہ حقیقی

معنوں میں اسلامی تعلیمات کو بروئے کار لایا جائے اور اسلام کی روشنی میں اُس سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام کی اصلاح کی جائے جس نے اسلام کو بدنام اور ملک کے محروم طبقات کو اسلام سے دور کر دیا ہے، اسلامی تعزیرات کو سختی سے نافذ کیا جائے تاکہ جرائم کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکا جا سکے جس نے ملک کا امن و سکون غارت کر کے رکھ دیا ہے اور اخوت و مساوات کی وہ فضا پیدا کی جائے کہ جس میں تورانی و افغانی کی تمیز ہی باقی نہ رہے اور اس لسانی و صوبائی تعصبات کا خاتمہ کر دیا جائے جس نے ہماری قومی زندگی میں زہر گھول دیا ہے اور ایک صوبہ اس کی وجہ سے جہنم زار بنا ہوا ہے ۔

اس لئے آزاد اراکین قومی اسمبلی سے مخلصانہ استدعاء ہے کہ وہ امانت و صداقت اور عدالت و شجاعت کا سبق پڑھتے ہوئے اسلامی اتحاد میں شمولیت ہی اختیار نہ کریں بلکہ دنیا کی امامت کا فریضہ بھی انجام دیں ۔ اسی میں ملک و ملت کی فلاح بھی ہے اور عند اللہ آپ کے سرخرو ہونے کی ضمانت بھی

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

چھوٹے گروپوں کی خدمت میں

چھوٹے گروپوں میں ایم کیو ایم سب سے بڑا ہے جسے قومی اسمبلی میں ۱۳ نشستیں حاصل ہیں دونوں بڑی پارٹیوں کی کوشش ہے کہ ایم کیو ایم کی حمایت اسے حاصل ہو جائے ۔ لیکن ایم کیو ایم کو سوچنا چاہیئے کہ جب اسے اپنی شناخت کے لئے مہاجر قومیت تسلیم کرانے پر اصرار ہے تو یہ ہجرت کس مقصد کے لئے کی گئی تھی؟ محض قومی، اقتصادی اور دنیاوی مفادات کے لئے یا اس سے بلند تر مقصد اسلام کے نفاذ کے لئے ؟ اگر اول الذکر پہلو کو ہی ترجیح دی گئی تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ یہ سرے سے ہجرت ہی نہیں ہے ۔ کیونکہ ہجرت تو نام ہی اللہ کے دین کے لئے ترک وطن کا ہے ۔ اس لئے مہاجر قومیت کا تشخص بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ ایم کیو ایم ایسی جماعت کو ترجیح دے جو اسلام کے نفاذ کو اہمیت دینے کا وعدہ کرے ۔ اس ضمن میں اگر ایم کیو ایم کو اپنے بعض ایسے مطالبات میں بھی ترمیم کرنی پڑے جن میں اسلامی تعلیمات سے

تجاوز پایا جاتا ہو تو اسے اس میں بھی تأمّل نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ملک، ملّت اور مذہب سب سے زیادہ اہمیت کے حامل ہیں ۔ دوسرے تمام مفادات کو ان کے تابع رکھنا چاہیئے نہ کہ دیگر مخصوص مفادات کو ان کے مقابلے میں ترجیح دی جائے ۔

دوسرا گروپ جمعیت علمائے اسلام (مولانا فضل الرحمن گروپ) ہے جسے قومی اسمبلی میں ۷ نشستیں حاصل ہیں ۔ یہ تقریباً علماء کا گروہ اور کلیتہً اسلامی نظام کا حامی ہے ۔ ذہنی اور نظریاتی لحاظ سے یہ یقیناً اسلامی اتحاد کے زیادہ قریب ہے ۔ علاوہ ازیں مولانا فضل الرحمن کئی مرتبہ ریمارکس دے چکے ہیں کہ وہ عورت کی سربراہی کو شرعاً صحیح تسلیم نہیں کرتے ۔ ان کے منشور میں بھی یہ شق شامل ہے کہ ملک کا سربراہ مسلمان مرد ہو گا اور انہوں نے اپنے تازہ بیان (۲۳ نومبر کے اخبارات میں) بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ ان کے منشور کے مطابق ان کے نزدیک ملک کا سربراہ بھی مسلمان مرد ہی ہونا چاہئیے ۔ اس لئے اس گروپ کا وزن بھی یقیناً اسلامی اتحاد کے پلڑے میں ہی پڑنا چاہیے ۔

عوامی اتحاد کے جو لیڈر منتخب ہوئے ہیں، وہ جمعیت علمائے پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں جو ملک میں نظام مصطفیٰ کے قیام کی داعی ہے ۔ اس دعوے اور اعلان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ گروپ اسلامی اتحاد کو تقویت پہنچائے ۔ بالخصوص جب کہ ایم ایچ انصاری لاہور کی کامیابی بھی اسلامی اتحاد کے امیدوار کے ایثار کی مرہون منت ہے ۔

فاٹا آزاد قبائلی علاقے کے ارکان قومی اسمبلی کی ۸ نشستیں ہیں ۔ ان کی طرف سے اخبارات میں متضاد خبریں چھپی ہیں ۔ تاہم اس علاقے کے لوگ اسلامی غیرت و حمیت میں ممتاز اور معروف ہیں ۔ انہیں فیصلہ کرتے وقت عنداللہ اور عندالناس دونوں عدالتوں کی بازپرس کا احساس ملحوظ رکھنا چاہیئے ۔ مسلّمہ اسلامی اصولوں اور ضابطوں سے انحراف کر کے وہ دونوں جہانوں میں مجرم بن سکتے ہیں ۔

اس طریقے سے آزاد ارکان اور مذکورہ گروپ اسلامی اتحاد کے ساتھ تعاون کریں تو یقیناً اسلامی اتحاد کی حکومت بن سکتی ہے اور یہ حکومت انشاء اللہ اس لحاظ سے مضبوط بھی ہو گی کہ تین صوبوں میں بھی اسی کی حکومت کے امکانات زیادہ واضح ہیں ۔

تاہم اگر ایسا نہیں ہوتا اور آزاد ارکان اور چھوٹے گروپس اسلامی اتحاد کے ساتھ

تعاون نہیں کرتے بلکہ وہ یا ان کی اکثریت آزاد رہے یا پیپلزپارٹی کے ساتھ تعاون کرنے کو پسند کرے تو پھر مرکز میں یقیناً پیپلزپارٹی کی حکومت بنے گی اور بننی چاہیئے کیونکہ یہ پھر اس کا مسلمہ جمہوری حق ہے ۔

اس مضمون کا مقصد یہ نہیں ہے کہ پیپلزپارٹی کو حکومت میں آنے سے ہر صورت میں روکا جائے بلکہ آئین و قانون اور مسلّمہ جمہوری اصول و روایات کی روشنی میں یہ کوشش کرنا ہے کہ اسلامی اتحاد کی حکومت بنے، کیونکہ مضمون نگار کے نزدیک پالیسی اور نظریات کے اعتبار سے اسلامی اتحاد کی حکومت ملک و ملّت کے لئے دوسری پارٹی کی حکومت کے مقابلے میں زیادہ بہتر او رمفید معلوم ہوتی ہے ۔
والعلم عنداللہ

اس لئے کسی کو یہ شبہ نہیں کرنا چاہیئے کہ اس مضمون سے مقصود جمہوری روایات سے انحراف ہے ایسا قطعاً نہیں ہے ۔ آزاد ارکان اور چھوٹے گروپوں کو آپس میں ملا کر حکومت سازی کرنا یہ بھی جمہوری روایات ہی کا حصہ ہیں اور اسی دائرے میں رہتے ہوئے مذکورہ اراکینِ قومی اسمبلی کو توجہ دلائی گئی ہے کہ وہ اپنا وزن ایسے پلڑے میں ڈالیں جن سے اسلامی اقدار و روایات کی پاسداری اور اخلاق و شرافت کی زیادہ امید ہے اور جس کے ذریعے سے وہ خود بھی خدا و خلق خدا کے سامنے سرخرو ہو سکیں ۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو پھر مرکز میں اور سندھ میں پیپلزپارٹی کی اور باقی صوبوں میں اسلامی اتحاد کی حکومتیں اس طرح بننی چاہئیں کہ دونوں فریق جمہوریت کے مسلّمہ اصول اور اقدار و روایات کو سامنے رکھیں اور ملک کو کسی بحران کی زد میں نہ آنے دیں ۔

پاکستان میں اب تک جمہوریت کا تجربہ ناکام ہی رہا ہے اور اس کی بنیادی وجہ (بعض طالع آزماؤں کے علاوہ) یہ بھی ہے کہ سیاستدانوں اور سیاسی پارٹیوں نے جمہوریت کی مسلّمہ اقدار و روایات کا اکثر احترام نہیں کیا اور وہ جمہوریت کے نام پر جمہوری روایات کو پامال کرتے رہے ہیں ۔ ہماری خواہش ہے کہ اب یہ تجربہ نہیں دہرایا جانا چاہیئے اور انتخابات کے ذریعے سے جس پارٹی کو جو مقام ملا ہے اسے بہرحال تسلیم کرنا چاہیئے اور وہ اسے دینا چاہیئے بصورت دیگر ملک پھر کسی خطرناک بحران سے دوچار ہو سکتا ہے ۔
لَاقَدَّرَہَا اللہ ۔

اسلامی جمہوری اتحاد کے قائدین سے

آخر میں اسلامی جمہوری اتحاد کے قائدین سے بھی یہ عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ وہ اتحاد کے اس ڈھانچے کو مستقل بنیادوں پر قائم کرنے کی کوشش فرمائیں اور اسی مستقل بنیاد پر اگر اتحاد کو حزب اختلاف کے بنچوں پر بیٹھنا پڑے تو اسے حالات کا مقابلہ کرنا اور مستقبل کی پیش بندی کا بھرپور اہتمام کرنا چاہیئے ۔ اگر یہ اہتمام ہو گیا تو انشاء اللہ وہ دن زیادہ دور نہیں جب قوم پھر اسی پر اپنے اعتماد کا اظہار کرے گی ۔ شرط وہی اتحاد، ایمان اور تنظیم کی اور اسلام سے غیر متزلزل وابستگی کی ہے ۔ ان تنصروا اللہ ینصرکم ویُثَبِّتْ اقدامکم (اگر تم اللہ کے (دین کی) مدد کرو گے تو اللہ تعالی تمہاری مدد فرمائے گا اور تمہیں ثبات قدمی عطا فرمائے گا)

بصورت دیگر انہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے
ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

پیپلزپارٹی کے اراکین سے

آخر میں پیپلزپارٹی کے اراکین سے بھی عرض ہے کہ "اسلام ہمارا مذہب ہے" کی شق اس کے منشور کا اور اسی طرح اس پارٹی کے دور میں بننے والے آئین میں "اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہے" اس آئین کا حصہ ہے علاوہ ازیں ۱۹۷۳ کے آئین میں وزیراعظم کے حلف نامے میں بھی اسلامی تعلیمات و احکام کی پابندی شامل ہے اور ان سب سے بڑھ کر اسلام ہی اس ملک کے قیام و بقاء کا ضامن ہے ۔

ان تمام چیزوں کا تقاضا یہ ہے کہ پیپلز پارٹی اگر مرکز میں حکومت بنائے جس کے امکانات زیادہ روشن ہیں، تو وہ اپنا وزیراعظم اپنی پارٹی کے کسی مرد کو بنائے اور عورت کو وزیراعظم یا صدر مملکت بنا کر اسلامی اصول اور ضابطے سے انحراف نہ کرے اگر اس نے یہ پہلا قدم ہی اسلام کے خلاف اٹھایا تو یہ اس کے اپنے منشور ، ۱۹۷۳ء کے

آئین اور ملک کے اساسی مقصد کی روح کے منافی ہو گا اور اس سے اس کے آیندہ عزائم اور کارکردگی کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔ بنابریں اس پہلے اقدام سے ہی اس کی اسلام سے وابستگی کا بھرم کھل سکتا ہے۔

مانو نہ مانو، جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے دیتے ہیں

(اداریہ "الاعتصام" ۲۳ دسمبر ۱۹۸۸ء)

نعرہ مساوات مرد وزن کی حقیقت

مساوات مرد وزن کا نعرہ اس قدر بیہودہ اور غیر فطری ہے کہ اس کے ایجاد کرنے والوں کی اپنی تاریخ اور زبان بھی اس کی کلیتہً تصدیق وتائید کرنے سے انکاری ہے۔ چنانچہ عورت کی نسوانی کمزوری اور انگریزی زبان کی جمہوریت ناپسندی کو پردہ اخفاء میں رکھتے ہوئے عورت کی سربراہی کی صورت میں اس کے لئے چیئرپرسن (Chair Person) کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے جو اپنی عمومیت کی بنا پر عورت اور مرد دونوں کو شامل ہوتا ہے۔

ہمارے صحافی، سیاسی مبصر اور زبان وادب سے تعلق رکھنے والے دیگر حضرات چونکہ انگریزی زبان کو اردو اور عربی کی نسبت زیادہ جانتے ہوتے ہیں، اس لئے وہ پیپلز پارٹی کی سربراہ کو "چیئرمین" تو نہیں کہتے۔ البتہ وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے کی بنا پر اسے "وزیر اعظم" کہنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے۔ حالانکہ مسئلہ یہاں بھی وہی ہے۔ جس طرح چیئرمین کا لفظ مذکر ہے اور مرد ہی کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح عربی اور اردو قواعد کی رو سے وزیر، مشیر اور وزیر اعظم سب الفاظ مذکر ہیں۔ اور مردوں ہی کے لئے استعمال ہونے چاہئیں۔ عورتوں کے کیلئے وزیرہ، مشیرہ اور وزیرہ عظمیٰ (وزارت عظمیٰ کی طرح) کے الفاظ بولے جاسکتے ہیں۔ مگر کیا کیجئے کہ آج سے بہت پہلے غالب کو بھی یہی شکوہ تھا۔

غلطی ہائے مضامیں مت پوچھ
لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

گویا کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ آج کے "ترقی یافتہ" دور میں بھی عورت کو اپنی سربراہی کے لئے مردوں کے سہارے کے ساتھ ساتھ مردانہ الفاظ کی بھی ضرورت ہے۔

(اقتباس از اداریہ "الاعتصام" از نعیم الحق نعیم)

ہم شرمندہ ہیں

۱۹۸۸ء کے انتخابات کے نتیجے میں ایک ایسے ملک کی سربراہ ایک عورت بن گئی ہے ، جو اسلام کے نام پر قائم کیا گیا تھا ۔ اور جو اسلام کا قلعہ باور کرایا جاتا تھا ۔ لیکن اسی ملک میں اسلام کا ایک مُسلّمہ اصُول نہایت بے دردی سے پامال کر دیا گیا ہے ۔ اس کے اسباب پر ہم تفصیلی گفتگو اگرچہ کر چکے ہیں ، تاہم اس کے باوجود

* ہم عالمِ اسلام کے سامنے شرمندہ ہیں کہ ہم پاکستان کا وہ امیج قائم نہیں رکھ سکے جو ہم ظاہر کرتے تھے ، وہ اسلامی تشخُّص برقرار نہیں رکھ سکے جو اس کے مقصدِ قیام سے وابستہ تھا اور اس کی وہ امتیازی حیثیت نہیں بچا سکے جو گزشتہ گیارہ سالوں میں بالخصوص نمایاں کی جاتی رہی تھی ۔

* ہم اپنے اُن عوام کے سامنے بھی شرمندہ ہیں جو اسلام سے والہانہ لگاؤ اور اس کی ابدی تعلیمات کی صداقت پر آج بھی پُختہ یقین رکھتے ہیں کہ ہماری باہمی سرپُھٹوّل سے ان کے اسلامی جذبات بجا طور پر مجروح ہوئے ہیں ، ان کے آبگینہ ہائے دل پارہ پارہ ہوئے ہیں اور اُن کے اعتماد کو سخت ٹھیس پہنچی ہے ۔

* اُن ماؤں ، بہنوں اور بیٹیوں کے سامنے ہم شرمندہ ہیں جن کو ہم نے بجا طور پر باور کرایا تھا کہ عورت کا دائرۂ عمل گھر کے اندر ہے ۔ بیرونی سرگرمیاں ان کی عزّت ، وقار اوراحترام کے منافی ہیں ، وہ چراغِ خانہ ہے شمعِ انجمن نہیں ۔ ان کی حیثیت ایک ماں کی ہے ، ایک بیٹی کی ہے ، ایک بہن کی ہے اور ایک بیوی کی ہے ۔ لیکن اب اس کی وہ پانچویں حیثیت بھی تسلیم کر لی گئی ہے جو اسلام نے تسلیم نہیں کی ۔ چراغِ خانہ سے بڑھ کر اب وہ شمعِ محفل ہی نہیں ، شمعِ جمہوریت اور شمعِ مملکت بھی ہے ۔

* ہم شرمندہ ہیں اس طعنے پر بھی کہ قرآن و حدیث کے کئی شیدائیوں نے بھی بہت سی جگہ ایک عورت کی پارٹی ہی کو ووٹ دے کر عورت کی سربراہی کا راستہ ہموار کیا ہے ۔ یُوں بیگانوں ہی نے اسلام کے جگر پر تیر نہیں چلائے ، یہ کارنامہ اپنوں نے بھی سرانجام دیا ہے ع

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم
کہ بامن آنچہ کرد آں آشنا کرد

ہم شرمندہ ہیں بعض ان مذہبی بہروپیوں کے کردار پر بھی جنھوں نے ایک

عورت کو اس کی وزارتِ عظمیٰ پر مبارکباد کے پیغامات ارسال کر کے اسلامی غیرت و حمیت کو نیلام کر دیا ہے ۔

ہم شرمندہ ہیں سُنّی عوام کی اس بھیڑچال پر بھی کہ انہوں نے اپنے ووٹوں سے ایک ایسے اقلیتی فرقے کی ایک بہت بڑی تعداد کو قومی و صوبائی اسمبلیوں میں پہنچا دیا ہے جس کا کردار ملّت کے حق میں ہمیشہ مشکوک بلکہ سخت خطرناک رہا ہے ۔

ہم شرمندہ ہیں اُس فریب خوردگی پر بھی جو "جمہوریت" کے نام پر ہم مسلسل کھا رہے ہیں ۔ اور اس دفعہ بھی کھایا جس کی وجہ سے ایک اقلیّت اکثریّت پر حکمرانی کرتی رہی ہے اور اب پھر ایک محدود اقلیّت اکثریت پر مُسلط ہو گئی ۔ "جمہوریت" کی یہ سب سے بڑی کمزوری اور خامی بھی ہمیں خوبی اوربھلائی نظر آتی ہے ۔

کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

ہم شرمندہ ہیں اس بات پر بھی کہ جو "جمہوریت" ہمارے ملک کےلئے بالعموم اور ہمارے مذہب کے لئے بالخصوص سخت تباہ کن چیز ہے، اسے ہم نے اپنے مسائل کا "واحد حل" سمجھا ہوا ہے ۔ گویا درد کو درماں ، دُکھ کو علاج اور زہر قاتل کو آبِ حیات سمجھ لیا ہے

یہ کیا غضب ہے جفا جُو کو باوفا جانو
شفا مرض کو کہو درد کو دوا جانو

سب سے بڑھ کر ہم اپنے اللہ کے سامنے شرمندہ ہیں کہ ہماری کوتاہیوں، حماقتوں اور باہمی بُغض و عناد کی وجہ سے اس کے بیان کردہ اصُول وَقَرنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (عورتیں گھروں کے اندر ٹک کر رہیں) کی خلاف ورزی کا ارتکاب انفرادی طور پر کرتے کرتے، اجتماعی طور پر بھی ہم نے کر لیا ہے ۔ اس لئے اندیشہ ہے کہ ملّت کا یہ گناہ کہیں فطرت کی نظر میں ناقابلِ معافی نہ ہو

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

بلاشبہ ہم خدا و خلقِ خدا دونوں کے سامنے شرمسار ہیں اور طلب گارِ معافی بھی نیز ہم بارگاہِ الٰہی میں دعاء گو بھی ہیں کہ وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم اپنی شرمساری کو جلد از جلد دُور کر کے سرخروئی کا کوئی سامان عنداللہ و عندالناس کر سکیں ۔ ویرحم اللہ عبداقال آمینا ۔

(اداریہ "الاعتصام" ١٦ دسمبر١٩٨٨ء)

عورت کی سربراہی اور احادیثِ رسولؐ

ان مضامین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث تو متعدد جگہ آئی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ وہ
"قوم ہرگز فلاح نہیں پائے گی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دئیے"
اس کے علاوہ مزید دو حدیثیں اس مسئلے میں ہماری بہترین رہنمائی کرتی ہیں ، جو درج ذیل ہیں ۔ (ص ۔ ی)

اِذَاکَانَتْ اُمَرَاؤُکُم خِیَارَکُمْ وَاَغْنِیَاؤُکُمْ سُمَحَاؤَکُمْ وَأُمُورُکُمْ شُوْرٰی بَیْنَکُمْ فَظَهْرُ الاَرْضِ خَیْرٌلَّکُمْ مِنْ بَطْنِهَا وَاِذَا کَانَتْ اُمَرَاؤُکُمْ شِرَارَکُمْ وَأَغْنِیَاؤُکُمْ بُخَلاَؤَکُمْ وَاُمُورُکُمْ اِلٰی نِسَاءِکُمْ فَبَطْنُ الاَرْضِ خَیْرٌلَّکُمْ مِنْ ظَهْرِهَا[1]

جب تمہارے اُمراء تُم میں بہترین لوگ ہوں اور تمہارے دولت مند لوگ تم میں سے سخی لوگ ہوں اور تمہارے معاملات باہمی مشورے سے طے ہوتے ہوں تو زمین کی پشت تمہارے لئے اس کے پیٹ سے بہتر ہے ۔ اور جب تمہارے اُمراء تم میں بدترین لوگ ہوں ، تمہارے دولت مند لوگ تم میں کے بخیل لوگ ہوں اور تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے سپرد ہو جائیں تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی پشت سے بہتر ہوگا ۔"

یہ حدیث بھی اس قدر واضح ہے کہ اس کی کسی تشریح کی ضرورت نہیں ۔

(۲) حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک لشکر کہیں بھیجا تھا ، وہاں سے کوئی شخص فتح کی خوشخبری لے کر آیا ، آپؐ فتح کی خوش خبری سُن کر سجدے میں گر گئے ۔ اور سجدے کے بعد پیغام لانے والے سے تفصیلات معلوم فرمانے لگے ۔ اس نے تفصیلات بیان کیں ۔

---

[1] جامع الترمذی ، ابواب الفتن ۔ ص ۵۲ ج۲ ۔

وکان فیما حدثه من أمرالعدوّ و کانت تلیهم امرأة ، فقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم : هَلَكَتِ الرجالُ حِيْنَ أَطَاعَتِ النِّسَاءَ

مستدرک الحاکم ص۲۹۱ ج۴، کتاب الادب ، باب سجدة ، الشکر ۔ صححہ الحاکم ووافقہ الذہبی ۔

"ان تفصیلات میں اس نے دشمن کے بارے میں یہ بھی بتایا کہ ان کی سربراہی ایک عورت کر رہی تھی ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا ۔ "جب مرد ، عورت کی اطاعت کرنے لگیں تو وہ تباہ و برباد ہیں ۔"

جس بات کو رسول اکرمؐ نے اچھا فعل قرار نہیں دیا میں اسے کیوں کر اچھا قرار دے سکتا ہوں۔

بے نظیر کے وزیراعظم بننے پر سردار قیوم کا تبصرہ

اسلام آباد (نمائندہ خصوصی) جمعہ کو ایوان صدر مظفر آباد (آزاد کشمیر) سے نمائندہ جنگ سے بات چیت کرتے ہوئے آزاد کشمیر کے صدر سردار عبدالقیوم نے پنجاب کا وزیراعلیٰ منتخب ہونے پر نواز شریف کو مبارک باد دی اور توقع ظاہر کی کہ وہ مستقبل کی ذمے داریوں کا بھرپور احساس کرتے ہوئے جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے تحفظ کے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔

ان سے پوچھا گیا کہ آپ محترمہ بے نظیر بھٹو کو وزیراعظم بننے پر مبارک باد کیوں نہیں دے رہے، تو سردار قیوم نے کہا کہ میرا ان سے کوئی ذاتی جھگڑا نہیں ہے، وہ پاکستان کی وزیراعظم ہیں، مگر جس بات کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا فعل قرار نہ دیا ہو میں اسے کیوں کر اچھا قرار دے سکتا ہوں۔

(روزنامہ "جنگ" لاہور۔ ۳ دسمبر ۱۹۸۸ء، صفحہ ۳)

حدیث لن یفلح قوم ۔۔۔ الحدیث
اہل سنت کے دو مسلمہ اصول کی روشنی میں

حضرت ابوبکرہؓ سے مروی حدیث ہے کہ

"وہ قوم ہرگز کامیاب نہیں ہوگی جس نے ایک عورت کو اپنا حکمران بنا لیا۔"

بعض لوگ اسے رَدّ کرنے کے لئے صحابیٔ رسول حضرت ابوبکرہؓ تک کو مطعون کرنے کی اور بعض لوگ حضرت ابوبکرہؓ کے بعد کے راویوں پر جرح کرکے صحیح بخاری کی عظمت و اہمیت گھٹانے کی مذموم سعی کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں اہل سُنّت کے مُسلّمہ اصولوں کے خلاف ہیں ۔

اہل سُنّت کا ایک مسلّمہ اصول یہ ہے کہ اَلصَّحَابَۃُ کُلُّھُمْ عَدُوْلٌ (تمام صحابہؓ عادل ہیں)۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جس روایت کا سلسلۂ سند صحابی تک بالکل صحیح ہو تو وہ روایت صحیح ہے اور صحابی کے بارے میں سرے سے کوئی تحقیق ہی نہیں کی جائے گی ، کیونکہ تمام صحابہؓ عادل ہیں۔ یعنی حدیثِ رسولؐ بیان کرنے میں کسی بھی صحابی سے کذب اور تلبیس کا امکان نہیں ہے ۔ اس لئے جو لوگ حضرت ابوبکرہؓ کی کردار کُشی کر رہے ہیں، وہ اس مُسلّمہ اصول کے خلاف ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں ۔

اسی طرح حدیث کے دوسرے راویوں پر جرح کرکے روایت کو مخدوش قرار دینے کا مطلب صحیح بخاری کی اصحیّت کو مجروح کرنا ہے، حالانکہ صحیح بخاری کے بارے میں بھی امتِ مسلمہ کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ کتاب اللہ کے بعد حدیثِ رسولؐ کا صحیح ترین مجموعہ ہے اور اس کی کسی روایت کی تضعیف و تردید اس مسلّمہ عقیدے کے منافی ہے ۔ اسی لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے بجا طور پر فرمایا ہے :

اَمّا الصحیحان فقد اتفق المحدثون علیٰ ان جمیع مافیھما من المتصل المرفوع صحیح بالقطع و انھما متواتران الیٰ مصنفیھما وانہ کل من یھوّن امرھما فھو مبتدع متبع غیر سبیل المؤمنین (حجۃ اللہ البالغۃ ، ج ۱، ص ۱۳۴ ، مطبعۃ منیریہ ۔ مصر)

"صحیح بخاری و صحیح مسلم کے بارے میں محدثین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ ان کی تمام روایات متصل مرفوع اور قطعی طور پر صحیح ہیں اور ان کے مصنفین تک متواتر ہیں۔ اور ہر وہ شخص جو ان دونوں کتابوں کی اہمیت گھٹاتا ہے، وہ بدعتی اور مومنین کے راستے کو چھوڑ کر کسی اور راستے کا پیروکار ہے۔"

عورت کی سربراہی کا مسئلہ

اور

شُبہات و مغالطات کا ایک جائزہ

ارشاد احمد حقانی صاحب کے جواب میں

جناب ارشاد احمد حقانی ملک کے ایک مُسلّمہ سیاسی مُبصر اور معروف تجزیہ نگار ہیں ۔ ان کے سیاسی تجزیے اور تبصرے ملک کے سنجیدہ طبقوں میں غور اور توجہ سے پڑھے جاتے ہیں ۔ ان کے ذہنی رجحانات بھی اہل علم سے مخفی نہیں ، وہ پوری طرح کھل کر ایک قومی اخبار میں پیپلزپارٹی کے موقف کی بھرپور حمایت کر رہے ہیں، یہ چونکہ ان کا جمہوری حق ہے اس لئے اس سے صرف نظر کرتے ہوئے ۲۸ نومبر کے کالم میں انہوں نے ایک صحیح حدیث کو بھی جو مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے، فی الحال ہم اپنی گذارشات اسی موضوع تک محدود رکھتے ہیں ۔

۱ ۔ حدیث لن یفلح قوم ـــــ پر اعتراض ؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا فرمان ہے جو صحیح بخاری میں دو مقام پر درج ہے ۔ لن یفلح قوم ولوا امرہم إمرأة کہ ''وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہوگی جس نے اپنے اُمور ایک عورت کے سپرد کر دیے'' (صحیح بخاری ۔ کتاب المغازی، باب کتاب النبیؐ الی کسریٰ و قیصر و کتاب الفتن، باب ۱۸) ۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ فرمان سنداً بالکل صحیح ہے، اس کی صحت میں اہل علم کے درمیان قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ بجز اُس شرذمۂ قلیلہ کے جو سرے سے حجیتِ حدیث ہی کا قائل نہیں ہے ۔ اس فرمانِ رسولؐ کی بناء پر آج تک اُمتِ مسلمہ نے اپنا حکمران کسی عورت کو بنانا پسند نہیں کیا ۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کی چودہ صد سالہ تاریخ میں چاند بی بی اور رضیہ سلطانہ اور بھوپال کی حکمران چند بیگماتِ بھوپال

کے علاوہ مسلمان عورتوں کی حکمرانی کی مثالیں ناپید ہیں ۔ اور یہ مثالیں اس لئے قابل نمونہ نہیں کہ ان کو حکمران بنانے میں عوام کا کوئی دخل نہیں تھا ۔ یہ سب اُسی ملوکانہ طرز عمل کے نتیجے میں وارثِ تخت بنی تھیں جس ملوکیت کو آج کل کے سارے سیاسی دانشور ردّ کر چکے ہیں ۔

لیکن حقانی صاحب نے مذکورہ صحیح اور مسلّمہ حدیث کو یہ کہہ کر کہ "متعدد اہل علم مذکورہ حدیث کے راوی پر اسماء الرجال کے فن کی روشنی میں وزنی اعتراضات پیش کر چکے ہیں"۔

(روزنامہ "جنگ" لاہور ۔ ص ۳ ۔۲۸ نومبر ۱۹۸۸ء) ناقابل قبول قرار دینے کی کوشش کی ہے لیکن ہم نہایت ادب سے ان کی خدمت میں عرض کریں گے کہ موصوف اُن متعدد اہل علم کی نشاندہی بھی فرمادیں، تو اچھا ہے ۔ ورنہ ہمارے علم کی حد تک تو اہلسنت کے تمام اہل علم اس حدیث کو ہر لحاظ سے صحیح سمجھتے ہیں ۔ ہم یہی جاننا چاہتے ہیں کہ جن اہل علم نے "وزنی اعتراضات" کئے ہیں ۔ وہ کون ہیں؟ کس طبقے اور جماعت سے ان کا تعلق ہے اور ان کے اعتراضات کیا فی الواقع وزنی ہیں؟

۲ ۔ جنگِ جمَل میں حضرت عائشہؓ کے کردار سے استدلال

دوسری دلیل حقانی صاحب نے اس حدیث کو رد کرنے کے لئے یہ پیش فرمائی ہے کہ:۔

"چونکہ حضرت عائشہؓ نے ایک لشکر کی قیادت کی تھی (جنگ جمل میں) اور جو لوگ سیاسی لحاظ سے ان کے خلاف تھے، انہوں نے عورت کی سربراہی کے حوالے سے مذکورہ حدیث کا ذکر کیا ۔ دوسرے لفظوں میں اہلِ علم کا ایک حلقہ اس حدیث کو اپنی سند کے اعتبار سے اسقام سے خالی نہیں سمجھتا"

یہاں موصوف کی عبارت میں کچھ ابہام ہے ۔ غالباً ان کا مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے مخالف گروپ نے اس حدیث کے حوالے سے عورت کی سربراہی کو غلط قرار دینے کی کوشش کی جسے دوسرے گروپ نے صحیح نہیں سمجھا ، گویا ان کے نزدیک یہ حدیث اپنی سند کے اعتبار سے اسقام سے خالی نہیں تھی ۔ اگر یہی

مفہوم ہے تو یہ یقیناً غلط اور واقعات کے خلاف ہے ۔ اول تو حضرت عائشہؓ کے مخالف گروپ حضرت علیؓ کی طرف سے یہ حدیث پیش ہی نہیں کی گئی ۔ بلکہ یہ روایت حضرت ابوبکرہؓ سے مروی ہے جس کے شروع کے الفاظ یہ ہیں کہ

"مجھے جنگ جمل کے موقعے پر اس حدیث کے ذریعے سے اللہ نے بڑا فائدہ پہنچایا"۔

وہ فائدہ یہی تھا کہ حضرت ابوبکرہؓ خونِ عثمانؓ کے مطالبۂ قصاص میں حضرت عائشہؓ کے ہمنوا تھے جس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ ان کو حضرت عائشہؓ کی معیّت میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑتا، لیکن حدیثِ مذکور کی بنا پر وہ علیحدہ رہے اور عورت کی سربراہی تسلیم کرنے سے گریز کیا ۔ گویا یہ حدیث وہاں زیر بحث نہیں آئی ۔ نہ مخالف گروپ نے دوسرے گروپ کی قوت کو توڑنے کے لئے اس کا حوالہ دیا ۔ بلکہ از خود حضرت ابوبکرہؓ نے، جو حضرت عائشہؓ ہی کے گروپ کے آدمی تھے ۔ اپنے طور پر حدیث کا جو اقتضاء تھا، اس پر عمل کیا ۔ اس لئے اس دعوے میں کوئی حقیقت نہیں کہ اہل علم کے ایک حلقے نے اس حدیث کو اَسْقام سے خالی نہیں سمجھا ۔

بعض لوگ اس مقام پر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کا جنگ جمل میں حصہ لینے سے بھی تو عورتوں کے لئے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا جواز نکلتا ہے ۔ لیکن ایسے تمام حضرات کے علم میں یہ بات آنی چاہیئے کہ حضرت عائشہؓ ساری عمر اپنے اس اقدام پر نادم رہی ہیں، بلکہ یہاں تک آتا ہے کہ جب وہ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے کرتے سورۂ احزاب کی اس آیت وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ (عورتیں گھروں کے اندر رہیں) پر پہنچتیں تو زارو قطار روتیں، کہ مجھ سے جنگ جمل کے موقعے پر اس آیت کی خلاف ورزی ہو گئی تھی ۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا یہ اقدام ایک ہنگامی نوعیت کا اور ایک محدود قسم کا تھا، اور وہ حضرت علیؓ کے مقابلے میں خلافت کی اُمیدوار بھی نہیں تھیں ۔ اس لئے ایک تو عام نارمل حالات کے لئے اس سے استدلال کرنا صحیح نہیں ۔ دوسرے، عورت کی سربراہی کا مسئلہ اس سے کشید کرنے کا جواز بھی نہیں ۔

تیسری بات یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے خود بھی حدیث مذکور کی بنیاد پر حضرت عائشہؓ کا ساتھ دینے میں تأمّل کیا ہے جیسا کہ حضرت ابوبکرہؓ کی صراحت گزر چکی ہے ۔

ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرت عائشہؓ نے ان سے تعاون کی درخواست کی، تو انہوں نے جواب دیا۔

"آپ بلاشبہ ماں ہیں، آپ کا حق بھی بہت عظیم ہے۔ لیکن (میں آپ کا ساتھ دینے سے اس لئے معذور ہوں کہ) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہو گی جس نے اپنے معاملات عورت کے سپرد کر دیئے: (فتح الباری ، ج ۱۳، ص ۵۶)

چوتھی بات یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے واضح اور غیر مبہم احکامات و نصوص کے مقابلے میں کسی کا قول یا عمل حجت نہیں ہے۔ اس لئے کسی بھی شخصیت کے قول و عمل سے استدلال صحیح نہیں۔ ذرا حقانی صاحب اپنے حلقے کے علماء سے مسئلہ رضاعتِ کبیر میں حضرت عائشہؓ کا مسلک پوچھ لیں اور پھر بتلائیں کہ کیا وہ اس کو جمہور علماء کے مسلک کے مقابلے میں ماننے کے لئے تیار ہیں؟

۳۔ والیۂ سبا ملکہ بلقیس کے قرآن کریم میں ذکر سے استدلال

حقانی صاحب نے قرآن کریم میں ملکہ بلقیس کے ذکر سے بھی استدلال کیا ہے کہ قرآن نے ملکۂ بلقیس کی حکمرانی کے تذکرے میں کوئی اشارہ ایسا نہیں دیا جس سے اس ملکہ کے کردار کے بارے میں نکیر کا رنگ جھلکتا ہو۔ اس لئے اس واقعے سے بھی عورت کی حکمرانی کا جواز بلکہ تائید و تحسین کا پہلو نکلتا ہے۔

لیکن ہم عرض کریں گے کہ قرآن کریم میں کئی واقعات و قصص تاریخی طور پر اس انداز سے بیان کئے گئے ہیں کہ ان پر کسی قسم کی نکیر نہیں کی گئی ہے۔ کیونکہ وہاں مقصود صرف بیانِ واقعہ ہے اس کی تحسین یا تردید نہیں ہے۔ اس لئے قرآن و حدیث کے واضح نصوص کے مقابلے میں اس قسم کے واقعات سے اگر استدلال اپنے اندر جواز کا کوئی پہلو رکھتا ہے تو پھر تو اور بھی بہت کچھ ماننا پڑے گا۔ ہم یہاں اپنے نقطۂ نظر کی توضیح میں موصوف کی توجہ صرف ایک اور واقعے کی طرف مبذول کرائیں گے اور وہ ہے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ۔ اس واقعے میں دیکھئے کہ عزیز مصر (زلیخا کے خاوند) نے اپنی بیوی کے مکر کو (جو اس نے حضرت یوسف کے پھسلانے کے لئے

اختیار کیا تھا) دیکھ کر عورتوں لے بارے میں اس رائے کا اظہار کیا ۔ اِنَّهٗ مِنْ کَیْدِکُنَّ اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ (یوسف ۲۸) کہ ”عورتوں کا مکر بڑا عظیم ہے“ جس کا مطلب یہ ہے کہ عورتیں بڑی مکار ہیں ۔ قرآن کریم نے بغیر کسی ادنیٰ نکیر کے عزیز مصر کا یہ مقولہ نقل کیا ہے ، کیا حقانی صاحب کے استدلال کی رُو سے یہاں یہ کہنا صحیح ہو گا کہ عورتیں بڑی مکاّر ہوتی ہیں ۔ کیونکہ قرآن کریم میں بغیر کسی نکیر کے یہ قول نقل کیا گیا ہے؟

اور آگے چلئے جب زلیخا کا یہ واقعہ مصر کی عورتوں میں مشہور ہوا تو اس نے زنانِ مصر کو جمع کر کے حضرت یوسف علیہ السلام کے حُسن و جمال کا مشاہدہ کروایا اور عورتیں فی الواقع حضرت یوسف کے حُسن و جمال میں اتنی وارفتہ ہوئیں کہ انہیں اپنا ہوش و حواس بھی نہ رہا اور چُھریاں اپنے ہاتھوں پر پھیر لیں ۔ قرآن کریم نے اس واقعے کو بھی بغیر کسی نکیر کے نقل کیا ہے ۔ کیا اس سے یہ استدلال صحیح ہو گا کہ اس طریقے سے عورتوں کو مردوں کے حسن و جمال کے مشاہدے کی اجازت ہے ۔ کیوں کہ قرآن نے امرأۃ عزیز اور زنانِ مصر کا یہ واقعہ بغیر کسی نکیر کے نقل کیا ہے؟

اور آگے چلئے کہ زلیخا نے زنانِ مصر سے خطاب کرتے ہوئے کہاکہ یہ ہے وہ شخص جس کی بارگاہِ حسن میں میں نقدِ دل ہار بیٹھی ہوں ۔ کیا اب بھی تم مجھے ملامت کرو گی؟ قرآن نے بغیر کسی نکیر کے یہ قول بھی نقل کیا ہے ۔ کیا اس سے یہ استدلال کرنا جائز ہو گا کہ اگر کوئی منکوحہ عورت کسی حسین مرد کے عشق کے جال میں پھنس جائے تو اپنے اس فعل ناروا کے جواز و اثبات کے لئے اس کے حُسن و جمال کا چرچا اور دیدارِ یار کا اہتمام کرنا صحیح ہے تاکہ اس کی مجبوری کو جان کر اسے معذور گردانا جائے ۔

ذرا سوچئے! اس قسم کے سطحی استدلالات سے قرآن کریم کے محکم نصوص کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے؟

پھر یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں ہے کہ قرآن کریم نے ملکہ سبا کا ذکر اس انداز سے کیا ہے کہ جس سے اس کی تحسین اور دانش مندی کا اظہار ہوتا ہے اس واقعے کا تو آغاز ہی ہُد ہُد کی زبانی اس تعجب انگیز خبر سے کیا گیا ہے کہ:۔

”ایک عورت وہاں حکمران ہے جسے ہر چیز عطا کی گئی ہے، اور اس کے لئے بڑا تخت ہے، وہ عورت اور اس کی قوم اللہ کو چھوڑ کر سورج کی پوجا کرتی ہے اور شیطان نے ان کے عملوں کو ان کے لئے مُزیّن کر دیا ہے ۔ اور اس نے ان کو راہِ راست سے روک دیا ہے ۔ پس وہ راہ یاب نہیں ہوتے“۔

کیا اس صراحت سے یہ واضح نہیں ہے کہ ایک عورت کو حکمرانی کرتے ہوئے دیکھ کر ایک جانور تک نے حیرت و تعجب کا اظہار کیا اور اسی طرح اس کی سورج پرستی کو نشانۂ تنقید بنایا اور پھر اسے راہِ راست سے بھٹکا ہوا اور شیطان کے دامِ فریب میں پھنسا ہوا قرار دیا ہے لیکن حقّانی صاحب فرما رہے ہیں کہ "قرآن نے ملکۂ بلقیس کی حکمرانی کے پورے تذکرے میں کوئی ایسا اشارہ نہیں دیا جس سے اس ملکہ کے کردار کے بارے میں نکیر کا رنگ جھلکتا ہو"۔

پھر قرآن کریم میں بیان کردہ یہ پہلو کہ جب حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس کو یہ لکھا کہ

"میرے خلاف سرکشی کا راستہ اختیار مت کرو ۔ اور فرمانبردار بن کر میری خدمت میں حاضر ہوجاؤ!"

تو ملکۂ سبا نے گھٹنے ٹیک دیئے اور کوئی مزاحمت ومقاومت نہیں کی ۔ کیا یہ عورت کی حکمرانی کی کمزوری کی نشاندہی نہیں کرتا؟ اگر بادشاہ کوئی مرد ہوتا تو کیا وہ اتنی آسانی سے بغیر کسی مزاحمت کے گھٹنے ٹیکنے کے لئے تیار ہو جاتا؟

اور سب سے بڑھ کر قرآن ملکہ سبا کے مُشرکہ اور کافرہ ہونے کی صراحت کرتا ہے ۔ کیا اب اہل اسلام اتنے ہی بے بضاعت ہو گئے ہیں کہ ایک کافرہ و مشرکہ عورت کا کردار و عمل ہی ان کے لئے قابل تقلید نمونہ رہ گیا ہے؟ اس مقام پر تو افلاسِ علم پر ماتم کرنے کے ساتھ ساتھ، نگاہ کی نامسلمانی سے بھی فریاد کرنے کو جی چاہتا ہے ۔

بہرحال ملکہ سباء کے قرآن کریم میں ذکر کرنے سے عورت کی سربراہی کا جواز ایسا ہی ہے جیسے کوئی قصۂ یوسف کے ضمن میں بیان کردہ مذکورہ باتوں کو سندِ جواز عطا فرما دے ۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

۴ ۔ قرآن کریم سے ملوکیت کا جواز ہی نہیں، استحسان ثابت ہے

علاوہ ازیں اس تجدد پسند طبقے کا قرآن کریم سے تعلق و شغف کا حال تو یہ ہے کہ قرآن کریم میں "ملوکیت" کا جس انداز سے ذکر آیا ہے اس سے یقیناً ملوکیت

(بادشاہی نظام) کا جواز ہی نہیں نکلتا تحسین و تائید کا رنگ صاف جھلکتا ہے لیکن یہ طبقہ ملوکیت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ۔ اللہ تعالی نے بنو اسرائیل پر جو احسانات کئے اور جن انعامات سے ان کو نوازا قرآن کریم میں ان کے ضمن میں جہاں اور نعمتیں گنوائی ہیں ، ایک نعمت یہ بھی بیان کی ہے کہ تمہارے اندر انبیاء پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں ملوک (بادشاہ) بھی بنایا ۔

اُذْکُرُوْا نِعْمَۃَ اللہِ عَلَیْکُمْ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَاءَ وَجَعَلَکُمْ مُّلُوْکاً (المائدۃ ۔ ۲۰)

"اللہ کی وہ نعمتیں یاد کرو جو تم پر ہوئیں، جب کہ اس اللہ نے تمہارے اندر انبیاء بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا"۔

حضرت طالوت کی بادشاہت کی تحسین ہی نہیں ملتی بلکہ قرآن سے یہاں تک معلوم ہوتا ہے کہ بطور بادشاہ ان کا انتخاب بھی اللہ تبارک و تعالی نے ہی فرمایا ۔ اِنَّ اللہَ اصْطَفٰہُ عَلَیْکُمْ وَزَادَہٗ بَسْطَۃً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللہُ یُؤْتِیْ مُلْکَہٗ مَنْ یَّشَاءُ ۔ بلکہ آیت کے آغاز میں فرمایا ۔

اِنَّ اللہَ قَدْ بَعَثَ لَکُمْ طَالُوْتَ مَلِکاً (البقرہ ۲۷)

"اللہ تعالی نے طالوت کو تمہارے اُوپر (بادشاہی کرنے کے لئے) پسند فرمایا ہے اور اس کو علم و جسم میں فراخی عطا فرمائی ہے"۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی اللہ تعالی نے نبوت کے ساتھ ساتھ بادشاہت سے بھی سرفراز فرمایا تھا اور پھر ان کی حسبِ خواہش یہ بادشاہت بھی ایسی زبردست اور بے مثال تھی کہ قیامت تک ایسی بادشاہت کسی کو نصیب نہیں ہو گی ۔ کیونکہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعاء فرمائی تھی ۔ رَبِّ ھَبْ لِیْ مُلْکاً لَّا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ (سورۂ ص ۔ ۳۵) جسے اللہ تبارک و تعالی نے شرفِ قبولیت سے نوازا اب ایسا جلیل القدر بادشاہ کہ جس کی حکمرانی جن و انس کے علاوہ وحوش وطیور اور ہوا پر بھی ہو، قیامت تک نہیں ہو گا ۔

کیا نبیوں تک کو بادشاہی دے کر اللہ تعالی نے یہ واضح نہیں فرما دیا ہے کہ بادشاہی نظام فی نفسہ مذموم نہیں ہے، بلکہ محمود و مستحسن ہے جس چیز کو اللہ نے اپنے نبیوں کے لئے پسند فرمایا ہو، اس کے استحسان و جواز میں شک کرنا بھی ایمان کے منافی ہے ۔ اس کے برعکس جمہوریت کی بابت قرآن کریم سے واضح ہوتا ہے کہ یہ نظام اللہ

تعالیٰ کو پسند نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اکثریت کے پیچھے چلنے سے اس لئے منع فرمایا ہے کہ اکثریت ہمیشہ گمراہوں کی ہی ہوتی ہے ۔ بنابریں اکثریت کے پیچھے چلنے والے بھی گمراہ ہو جاتے ہیں ۔ اپنے پیغمبرؐ سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ۔ وَ اِنْ تُطِعْ اَکْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (الانعام ۔ ۱۱۶) "اے پیغمبر! اگر تو اہل زمین کی اکثریت کے پیچھے چلے گا تو وہ تجھ کو بھی اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی"۔

اور "جمہوریت" نام ہی عوام کی اکثریت کا ہے تو قرآن کریم کی رُو سے "جمہوریت" کیونکر ایک صحیح نظامِ حکومت ہو سکتا ہے؟

۵ ۔ قرآن کریم میں عورت کی سربراہی کے عدمِ جواز کے دلائل

آخر میں جناب حقانی صاحب نے فرمایا ہے کہ

"قرآن ہی سے دوسرے بہت سے دلائل بھی دیئے جاتے ہیں ۔ جو عورت کی سربراہی کے بارے میں پائے جانے والے شکوک کی سنگینی کم کرتے ہیں یا انہیں بالکل رفع کر دیتے ہیں"۔

مگر افسوس ہے کہ موصوف نے وہ دلائل ذکر نہیں فرمائے، کاش وہ ان کی صراحت بھی فرما دیتے ۔ کیونکہ ہم تو اب تک قرآنی دلائل ہی کی رُو سے عورت کی سربراہی کے جواز کے قائل نہیں ہیں ۔ قرآن نے ہی اُمہات المومنین کو ہدایت دیتے ہوئے ایک ہدایت یہ دی ہے کہ "وہ گھروں میں رہیں" ظاہر بات ہے کہ گھر کے اندر رہتے ہوئے جہانبانی کے فرائض ادا نہیں کئے جا سکتے ۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ سربراہی و قیادت کی ذمّے داریوں سے عورت کو اس کی فطری صلاحیتوں، صنفی مجبوریوں اور مقصدِ تخلیق کے اعتبار سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے اور اس میں قطعاً عورت کی اہانت نہیں ہے ۔ جیسا کہ باور کرایا جاتا ہے بلکہ مرد و عورت کی الگ الگ صلاحیتوں کے اعتبار سے ان کا دائرۂ کار بھی الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف رکھا گیا ہے ۔

اسی طرح قرآن میں فرمایا گیا ہے ۔ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ (النساء ۔ ۳۴)

"مرد عورتوں پر قوّام ہیں ۔ بسبب اس کے جو فضیلت دی اللہ

نے بعض کو بعض پر اور بسبب اس کے جو مرد اپنے مالوں میں
سے خرچ کرتے ہیں"۔

قوّام کے معنی حاکم، نگران وغیرہ کے ہیں اور اس کی جو دو وجہیں آگے بیان کی گئی ہیں کہ ایک تو مرد کو عورت کے مقابلے میں جسمانی قوت و توانائی زیادہ عطا کی گئی ہے اور دوسرے، مرد عورت کے نان و نفقہ کا ذمّے دار اور کفیل ہے، یہ دونوں وجہیں قوّام کے اس مفہوم کو واضح کر دیتی ہیں اور ان کی موجودگی میں اس کا کوئی دوسرا مفہوم نہیں لیا جا سکتا ۔ جب قرآن کریم کی رُو سے عورت گھر کی نہایت مختصر اور محدود زندگی میں مرد کے مقابلے میں سربراہ نہیں بن سکتی تو اُس قرآن کریم کی رُو سے ایک ملک کی سربراہ کیسے بن سکتی ہے؟

اس وقت چونکہ مقصود اس موضوع پر مفصّل بحث یا اس کے دلائل کا استقصاء نہیں ہے ورنہ قرآن و حدیث کے اور بہت سے محکم اور واضح دلائل مزید پیش کئے جا سکتے ہیں ۔ فی الحال مذکورہ گذارشات سے مقصود صرف ان غلط فہمیوں کا ازالہ ہے جو جناب حقانی صاحب کے کالم سے اسلام کے ایک مسلّمہ اصول اور ضابطے کے سلسلے میں پیدا ہوتی ہیں یا کی گئی ہیں ۔

ہمیں معلوم ہے کہ اس مضمون کی اشاعت سے قبل ہی محترمہ بے نظیر وزارتِ عُظمیٰ پر فائز ہو چکی ہیں لیکن یہ ان مسلمانوں کے کردار عمل ہی کا ایک رُخ ہے جن کے کردار و عمل میں اب اسلام کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی ۔ اس لئے جہاں اور بہت سی خلافِ اسلام باتیں ہم برداشت کر رہے ہیں خواہی نخواہی عورت کی سربراہی بھی برداشت کرنی ہی پڑے گی ۔ تاہم ہماری گذارش اہلِ قلم اور اہلِ صحافت سے یہی ہے کہ کم از کم ایک برائی کو نیکی، ایک حرام کو حلال اور ایک ناجائز کو جائز قرار دینے کی کوشش تو نہ فرمائیں ۔ قرآن ہماری خواہشات کا ساتھ نہیں دیتا تو اسے آپ کھینچ ہی کیوں کرتے ہیں، اسے اپنی جگہ ہی رہنے دیجئے لیکن خدا را وہ بات تو اس کے ذمّے نہ لگائیے جو اس میں نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف وہ بہ بانگِ دُہل اعلان کر رہا ہے ۔ وما علینا الاالبلاغ المبین ۔

تختِ فارس کی حکمران عورت کا نام پوران دُخت بنت کسریٰ ہے

بعض لوگ حدیثِ بخاری کی صحت میں تشکیک پیدا کرنے کے لئے یہ کہتے ہیں کہ فارس کی جس عورت کی بابت کہا گیا ہے، یہی غلط ہے ۔ فارس (ایران) میں تو سرے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دَور میں کوئی عورت حکمران ہی نہیں بنی ہے ۔

لیکن یہ دعویٰ یکسر غیر صحیح ہے اور تاریخ سے ثابت ہے کہ بہ عہد نبویؐ فارس میں عورت حکمران بنی ہے چنانچہ تاریخ طبری میں اس کا نام بوران بنت کسریٰ پرویز بن ہرمز بتلایا گیا ہے (تاریخ طبری، عربی ، ج۲ ۔ ص ۲۳۱ طبع دارالمعارف مصر) حافظ ابن حجرؒ نے بھی فتح الباری (ج ۸ ص ۱۲۸ ۔ و ج ۱۳۔ ص ۵۶) میں بوران نام ہی بتلایا ہے ۔ تاہم اسے بنت شیرویہ بن کسریٰ بن پرویز لکھا ہے ۔ جب کہ طبری نے اسے بنتِ کسریٰ بتلایا ہے ۔ اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ۔ اس اعتبار سے بوران شیرویہ کی لڑکی نہیں بہن بنتی ہے ۔ فارسی اور اُردو تاریخ دان کسریٰ کا نام بالعموم خسرو پرویز لکھتے ہیں ۔ اس اعتبار سے وہ بوران کو خسرو پرویز کی دختر لکھتے ہیں ۔ چنانچہ مجلس ترقی ادب لاہور کے زیر اہتمام مطبوعہ تاریخ ایران میں اس حکمران عورت کا ذکر بایں الفاظ مرقوم ہے:۔

"اس کے بعد خسرو پرویز کی بیٹی بوران دُخت تخت نشین ہوئی ۔ ثعالبی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بوران دخت کے تخت نشین ہونے کی خبر ملی تو فرمایا ، "وہ قوم جو ایک عورت کو حکومت کی عنان سونپتی ہے، وہ کبھی آسائش نہیں دیکھ سکتی" وہ چھ ماہ ہی حکومت کر پائی تھی کہ بیمار ہو گئی اور بیماری سے جانبر نہ ہو سکی" (تاریخ ایران، مؤلّفہ پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی، جلد اول ص ۵۲۵ ۔ طبع ۱۹۶۷ء) ۔

علاوہ ازیں اس تاریخ ایران میں اسے ۶۳۰ عیسوی کے بعد کا واقعہ قرار دیا گیا ہے، جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ۶۱۰ عیسوی میں ہوئی ہے ۔ خلعت نبوّت سے سرفراز ہونے کے بعد آپؐ کے تیرہ سال مکّے میں گزرے اور اس کے بعد ہجرت

فرمائی ، اس اعتبار سے یہ واقعۂ فارس ، جس میں عورت کو حکمرانی ملی ، گویا ، ہجری کے بعد رُونما ہوا ہے ۔ کیونکہ ہجرت کا ساتواں سال ۶۳۰ عیسوی میں پڑتا ہے ۔ اس کی تائید اسلامی مصنفین کی صراحتوں سے بھی ہوتی ہے اور وہ اس طرح کہ عورت کی حکمرانی کا یہ واقعہ اُس بددعاء کے بعد رُونما ہوا ہے جب کسریٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ مکتوب پھاڑ دیا تھا جو آپؐ نے دعوت اسلام قبول کرنے کے لئے اس کو لکھا تھا، تو آپؐ نے اِس کے حق میں بددُعا، فرمائی تھی کہ اس کی حکومت بھی اسی طرح پارہ پارہ ہو جائے فَدعا عَلَیْھِمْ اَنْ یُمزَّقُوْا کُلَّ مُمَزَّقٍ (صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی الیٰ کسریٰ و قیصر) اس ارسالِ دعوت و مکتوب کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ یہ ۷ ہجری کے اوائل کا واقعہ ہے اور امام ابن سعد نے بھی اس سن کو جزم کے ساتھ تسلیم کیا ہے (فتح الباری ، ج ۸ ۔ ص ۱۲۷) ۔

اس کے فوراً بعد ہی کسریٰ (خسرو پرویز، شاہِ فارس) کو اس کے اپنے بیٹے شیرویہ نے قتل کر دیا ۔ یہ شیرویہ قباد دوم کے نام سے تخت طاؤس پر فروکش ہوا ۔ اس ظالم نے صرف اپنے باپ کو ہی نہیں مارا، بلکہ اپنے سولہ بھائیوں کو بھی اس اندیشے کے پیش نظر موت کے گھاٹ اتار دیا کہ مبادا کوئی اس کی حکومت چھیننے کے لئے کھڑا ہو جائے ۔

باآلآخر چھ مہینے کے بعد ایک وبائی مرض (پلیگ) کا شکار ہو کر اپنے باپ اور بھائیوں کا یہ قاتل حکمران بھی لقمۂ اجل بن گیا ۔ جس کے بعد اس کی بہن بوران دخت بنت کسریٰ تختِ فارس کی وارث اور ملک فارس کی حکمران بنی ، جس کی خبر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو آپؐ نے زیر بحث مذکورہ فرمان ارشاد فرمایا، جس کی صداقت بھی چند سالوں میں ہی دنیا نے دیکھ لی کہ فارس سے یہ مجوسی حکومت ہی ختم ہو گئی اور اس کی جگہ وہاں اسلام کا جھنڈا لہرانے لگا ۔

مولانا مودودی مرحوم کے سیاسی موقف سے استدلال

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر عورت کی سربراہی کی گنجائش اسلام میں نہ ہوتی تو ایّوب خاں کے دَور میں صدارتی انتخاب میں علماء فاطمہ جناح کی حمایت نہ کرتے ۔ جب کہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ صاحب اور بہت سے علماء نے اُس وقت ایّوب خان خاں کے مقابلے میں فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی ۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ اُس وقت بعض علماء نے ایوب خان کے مقابلے میں محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت کی تھی، جن میں بالخصوص مولانا مودودی مرحوم سرِفہرست ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ ان حضرات نے فاطمہ جناح کی حمایت یہ سمجھتے ہوئے نہیں کی تھی کہ عورت کا سربراہِ حکومت بننا اسلام میں جائز ہے، بلکہ انہوں نے اسلام کے اصول (کہ مرد و عورت کا دائرۂ کار ان کی فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے الگ الگ ہے) کو تسلیم کرتے ہوئے ایک اضطرار کے طور پر حمایت کی تھی ۔ جیساکہ ان کے بیانات، تقاریر اور مضامین وغیرہ اور اُس دور کے مخصوص پس منظر سے واضح ہے ۔ علاوہ ازیں مولانا مودودی مرحوم کی تو ایک مفصل کتاب ـ۔ پردہ ـ۔ اس موضوع پر موجود ہے جس میں انہوں نے پوری تفصیل اور مکمل دلائل سے اسلام کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی ہے اور اپنی تفسیر "تفہیم القرآن" میں بھی متعدد جگہ مغربی نظریۂ مساواتِ مرد و زن کی بھرپُور تردید کی ہے ۔ اس لئے ان کے ایک عارضی، وقتی اور سیاسی موقف کو، جو ان کے خیال میں ایک اضطراری اقدام تھا، بنیاد بنا کر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کے نزدیک عورت سربراہِ حکومت ہو سکتی ہے یا چونکہ انہوں نے ایک عورت کی حمایت کی تھی تو گویا یہ اس بات کی سند ہے کہ اسلام میں عورت کے سربراہ ہونے کی اجازت موجود ہے ۔

ایسا دعویٰ خود مولانا مودودی مرحوم پر بھی ظلم ہے اور اسلام پر بھی ظلم ہے ۔ کیوں کہ یہ واقعات کے سراسر خلاف ہے ۔ رہ گیا مسئلہ ان کے اضطرار کے طور پر حمایت کرنے کا، کہ اس کی کیا حیثیت ہے؟ تو اس کے بارے میں اب سکوت زیادہ بہتر ہے

کیونکہ اب ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو چکا ہے ۔ اگر ان کی دینی بصیرت، ملّی درد اور سیاسی فہم نے اسے "اضطرار" سمجھنے میں ٹھوکر نہیں کھائی تو یقیناً عنداللہ وہ مجرم نہیں ہوں گے، بلکہ اُمید ہے کہ وہ دُگنے اجر کے مستحق ہوں گے ۔ اور اگر ان سے اس موقعے پر اجتہادی غلطی ہوئی ہے، تب بھی وہ ایک اجر کے مستحق بہرحال قرار پائیں گے ۔ اور اگر اسے ایک اجتہادی امر نہ سمجھا جائے بلکہ ان کے موقف کو "سیاسی مصلحت" باور کیا جائے ، پھر تو مسئلہ بالکل ہی واضح ہو جاتا ہے ۔ کیونکہ سیاسی مصلحت کے طور پر اور بھی بعض کام انہوں نے غلط کئے ہیں جس سے ان کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا ۔ مثلاً "عید میلاد" کے جلوس کے مولانا مودودی مرحوم قائل نہیں تھے اور اسے صریحاً غلط اور ناجائز ہی سمجھتے تھے (ملاحظہ ہو، رُوداد جماعت اسلامی، حصہ پنجم، ص ۱۲۲، طبع جون ۱۹۸۲ء) لیکن ۱۹۷۰ء کے انتخابات کے موقعے پر، جب ان کو "شوکتِ اسلام" کا جلوس نکالنے کی ضرورت پیش آئی تھی تو اس وقت انہوں نے ایک سوال کے جواب میں جُلوس میلاد کا جواز بھی اس اندیشے کے پیشِ نظر تسلیم کر لیا تھا کہ اس موقعے پر اگر میں نے جُلوس میلاد کے عدمِ جواز کا فتویٰ دے دیا تو اس کا اثر کہیں "شوکتِ اسلام" کے جلوس پر نہ پڑ جائے (ملاحظہ ہو اخبار روزنامہ "ندائے ملت" لاہور ۱۸ ۔ مئی ۱۹۷۰ء)

خیال رہے شوکت اسلام کے جلوس کی تاریخ ۳۱ مئی ۱۹۷۰ء تھی جب کہ اُس سال "یوم میلاد" ۱۹ اپریل کو پڑا تھا ۔

ایک اور عبرت آموز اور دلچسپ لطیفہ

یہ لطیفہ بھی بڑا دلچسپ اور عبرت آموز ہے کہ اس وقت جماعت اسلامی کے اعلان کردہ جلوس "شوکت اسلام" کو ناکام بنانے کے لئے دیوبندی علماء کے ترجمان اخبارات (خدام الدین، لاہور، وغیرہ) نے جُلوس میلاد کی حمایت و تائید فرمائی اور لوگوں کو یہ باور کرایا کہ اصل جلوس تو "میلاد" کا ہے جس میں شریک ہونا چاہیئے یہ "شوکت اسلام" کا جلوس کیا ہے؟ دراں حالیکہ علمائے دیوبند خود بھی "جلُوسِ میلاد" کے قائل نہیں ہیں ۔

اس سے بہرحال یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض علماء سیاسی مصلحت کا شکار ہو کر شریعت کے تقاضوں کو بھی بعض دفعہ نہایت بے دردی سے پامال کر دیتے ہیں ۔ اس لئے اس قسم کے اقدامات زلّات اور لغزشیں ہیں جن سے استدلال نہیں کیا جا سکتا ۔ کیونکہ شریعت تو نام ہے قرآن و حدیث کا ۔ علماء کے قول و عمل کا نام شریعت نہیں

ہے ۔ ان کے قول و عمل کو بھی شریعت کی روشنی میں ہی دیکھا جائے گا، جو اس کے مطابق ہو گا، وہ ٹھیک ہے ۔ جس میں شریعت سے انحراف ہو گا، وہ مردُود ہے ۔

بہرحال جن علماء نے ایّوب خاں کے دَور میں فاطمہ جناح کی حمایت کی ہے، اس کے مختلف اسباب ہیں، جس کی وجہ سے ان کے طرزِ عمل سے اسلام کا مُسلّمہ اصول باطل قرار نہیں پا سکتا ۔

ایک باخبر صحافی کی طرف سے توضیح مزید

فاطمہ جناح کو صدارتی اُمیدوار نامزد کرتے وقت سیاسی استبداد کی جو صورت تھی، اور فاطمہ جناح کے جو وجوہ انتخاب تھے اس کی ضروی تفصیل ایک باخبر صحافی جناب مُحمد صلاح الدین صاحب مُدیر "تکبیر" کراچی کے حسبِ ذیل اقتباس میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے وہ لکھتے ہیں ۔

"اُس وقت معاملہ یہ تھا کہ ایّوب خان کی آمریت سے نجات پانے کی کوئی مناسب صورت تلاش کی جا رہی تھی پہلے اعظم خاں کا انتخاب کیا گیا ۔ لیکن اس کی بھنک پڑتے ہی خصوصی پیغامبر مولوی فرید احمد کو لاہور ائیرپورٹ پر گرفتار کر لیا گیا اور اعظم خاں بھی گرفت میں لے لئے گئے ۔ چودہری محمد علی ، نواب زادہ نصر اللہ خان اور دیگر حضرات نے مادرِ ملّت کی شخصیت میں ایوب خان کا توڑ تلاش کیا ۔ ان پر ہاتھ ڈالنا آسان نہ تھا ۔ مولانا مودودیؒ اس وقت جیل میں تھے، فتوے کے لئے پہلے مولانا مفتی محمد شفیع سے رجُوع کیا گیا ۔ ان پر دباؤ بڑھا تو دوسطر کا فتویٰ جاری کر دیا کہ :۔

"دو برائیوں میں سے کم تر برائی کا انتخاب کر لیا جائے"۔

ایوب خاں اپنی پرویز نوازی ، رؤیت ہلال اور عائلی قوانین کی وجہ سے دینی حلقوں میں خاصے ناپسندیدہ قرار پا چکے تھے، مادرِ ملّت صرف عورت نہیں تھیں ، قائداعظم محمد علی جناح کی بہن تھیں ۔ پختہ کردار، نیک نام اور انتہائی محترم خاتون تھیں ، سن رسیدہ تھیں ۔ متنازعہ نہ تھیں، ان کے کردار پر کسی حرف گیری کی گنجائش نہ تھی، ان کی ذات سے کوئی اسکینڈل وابستہ نہ تھا، ان سے قوم کی گہری عقیدت تھی ۔ مولانا مودودیؒ کی رہائی سے قبل ہی وہ رائے عامہ کی ترجمان بن چکی تھیں، مولانا نے رہائی پاتے ہی ان کے حق میں رائے دی ـــــ وہ عمر کے اُس حصے میں تھیں جہاں شریعت پردے وغیرہ کی پابندیوں کو خود ہی نرم کر دیتی ہے ۔ جہاں وہ قباحتیں باقی

نہیں رہتیں جن کے پیش نظر ٹک کر گھر بیٹھنے اور پردے کے حدود قائم رکھنے کا حکم دیا گیا ہے ۔ اس سب کے باوجود مولانا مودودی کی رائے سے اختلاف کیا گیا ۔ ان کی اپنی جماعت کے لوگوں نے اختلاف کیا ۔۔۔ یہ ایسی رائے نہیں تھی جسے علمائے کرام اور عام مسلمان آسانی سے ہضم کر لیتے ۔ خود مولانا کے فیصلے میں خصوص تھا، عموم نہیں ۔

اس معاملے کا دوسرا اور زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ مادرِ ملت سربراہِ حکومت بننے کی اُمیدوار نہیں تھیں ۔ انہوں نے مذاکرات کرنے والے لوگوں سے صاف کہہ دیا تھا کہ میں تحریک کی قیادت کر سکتی ہوں، ملک کی صدارت مجھے منظور نہیں ۔ انہیں جب بتایا گیا کہ موجودہ نظام میں امیدواریٔ صدارت کے بغیر کوئی تحریک نہیں چل سکتی تو انہوں نے عبوری مدّت کا سوال اٹھایا اور پوچھا کہ میری جگہ اصل صدر لانے میں تمہیں کتنا عرصہ لگے گا ۔ تو جواب دیا گیا کہ تقریباً ایک سال ۔ مگر انہوں نے اس "طویل عرصے" کو مسترد کر دیا اور صرف تین ماہ کے اندر اندر نیا صدر منتخب کرنے کی مُہلت دی ۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو وہاں حصولِ حکومت کا مُحرک ہی موجود نہیں تھا ۔ وہ کسی خواہش اقتدار کے بغیر محض آمریت سے نجات دلانے کے لئے میدان میں نکلنے پر آمادہ ہوئی تھیں ۔ اب ان کی عمر، مخصوص حالات ، محدود اور متعین مقصد ، حصول اقتدار کے مُحرک کی عدم موجودگی اور صفاتِ کردار سب کو ذہن میں رکھا جائے تو اس مثال سے عورت کی حکم رانی کا عام جواز نکال لینے کا کوئی قرینہ نہیں بنتا، اس کا کہیں اور اطلاق ہو گا تو عمر، صفات کردار اور مخصوص و محدود مقصد سب ہی کو پیش نظر رکھا جائے گا ، محض ہم جنس ہونا کافی نہیں ہو گا ۔ کہا جا سکتا ہے کہ اب بھی تو آمریت سے نجات پانے کے لئے ایک طاقتور حریف کی ضرورت تھی، جواباً عرض ہے کہ وہ "آمر" تو جنگ اقتدار سے قبل ہی اللہ کو پیارا ہو گیا، اب اس کے مقابل آنے کی کیا ضرورت؟ دوسرے مادرِ ملّت کی طرح خواہشِ اقتدار ترک کیجئے، قوم کی قیادت کا حق ادا ہو گیا ۔ جمہوریت کی منزل سر ہو گئی ۔ اب اپنا متبادل آگے لائیے ۔ یہاں کوئی ایسی ہنگامی یا اضطراری صورتِ حال نہیں کہ عورت کی سربراہی کے بغیر ملک و ملّت کا کام ہی نہ چل سکے"۔ (ہفت روزہ "تکبیر" کراچی، ص ۱۲ تا ۱۳-۱۵ دسمبر ۱۹۸۸ء)

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا فتویٰ اور اس پر تبصرہ

عورت کی سربراہی کے مسئلے میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی رائے سے بھی استدلال کیا جا رہا ہے ۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نقطۂ نظر بھی واضح کر دیا جائے ۔ مولانا تھانوی مرحوم نے حکومت کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں ۔

ایک قسم وہ جو تامّ بھی ہو اور عام بھی ۔ تامّ سے مراد یہ کہ حاکم بانفرادہ خود مختار ہو ۔ یعنی اس کی حکومت شخصی ہو ۔ اور اس کے حکم میں کسی حاکمِ اعلیٰ کی منظوری کی ضرورت نہ ہو ۔ گو اس کا حاکم ہونا اس پر موقوف ہو ۔ اور عام یہ کہ اس کی محکوم کوئی محدود قلیل جماعت نہ ہو ۔ مثلاً کسی عورت کی سلطنت یا ریاست بطرز مذکور شخصی ہو ۔

دوسری قسم وہ جو تامّ ہو مگر عام نہ ہو جیسے کوئی عورت کسی مختصر جماعت کی منتظم بلاشرکت ہو ۔

تیسری قسم وہ جو عام ہو مگر تام نہ ہو ۔ جیسے کسی عورت کی سلطنت جمہوری ہو کہ اس میں والیٔ صوری درحقیقت والی نہیں ہے ۔ بلکہ ایک رکنِ مشورہ ہے اور مُشیروں کا مجموعہ والیٔ حقیقی ہے ۔

مولانا تھانویؒ صاحب فرماتے ہیں کہ حدیث کے الفاظ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث میں مراد پہلی قسم یعنی شخصی حکومت ہے جس میں سربراہِ حکومت کو مکمل اختیارات حاصل ہوتے ہیں ۔ بخلاف قسم ثانی و ثالث کے کہ وہاں حاکمیت کامل نہیں ہے بلکہ وہ مشورۂ محضہ ہے گو اس مشورے کو دوسرے منفرد مشوروں پر ترجیح حاصل ہو لیکن اس میں ولایت کاملہ کی شان نہیں ہے ۔ علاوہ ازیں مولانا یہ بھی فرماتے ہیں، کہ ایسی حکومت کی حقیقت محض مشورہ ہے اور عورت مشورے کی اہل ہے اس بنا پر اگر سلطنت شخصی بھی ہو مگر ملکہ التزاماً اپنی انفرادی رائے سے کام نہ کرتی ہو تو وہ بھی اس حدیث میں داخل نہیں ہو گی ۔ کیونکہ عدمِ فلاح (ناکامیابی) کی علّت نقصانِ عقل ہے ۔ اور جب مردوں کے مشورے سے اس کا انجبار (ازالہ) ہو گیا تو علّت مرتفع ہو گئی، تو معلول یعنی عدمِ فلاح بھی منتفی ہو گیا ۔ اس طرح ایسی ریاستیں ، جو عورتوں کے زیرِ فرمان ہیں، عدمِ فلاح کے حکم سے بری ہیں (مُلخّص از "امداد الفتاویٰ" ج ۵ ۔ ص ۹۹۔۱۰۱ مطبوعہ کراچی)

مولانا تھانویؒ نے یہ ساری گفتگو اُن چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے ضمن میں فرمائی ہے جو ہندوستان میں قائم تھیں ۔ اور ان میں بعض مسلمان ریاستوں میں عورت کے ہاتھ میں ریاست کی زمام تھی ۔ جیسے بھوپال ۔

یہ مسلم حکمران عورتیں ، اسلام کی پابند اور شریعت کے ضابطوں کو نہ صرف تسلیم کرنے والی تھیں بلکہ اپنی ریاست میں بھی اسلامی شریعت کی بالادستی انہوں نے قائم کی ہوئی تھی ۔ علاوہ ازیں حکمران خاندان میں موزوں مرد نہ ہونے کی وجہ سے بعض جگہ یہ صورت رُونما ہوئی کہ موروثی طور پر کسی عورت کو انتظامِ ریاست سنبھالنا پڑا ۔ بنابریں حکمران ہونے کے باوجود ان خواتین نے بے پردگی اختیار نہیں کی ۔ مردوں کے ساتھ بے محابا اور بے باکانہ اختلاط کا راستہ اختیار نہیں کیا اور سب سے بڑھ کر اپنے آپ کو عقلِ کل بھی نہیں سمجھا اور تمام معاملاتِ ریاست سمجھدار اہلِ علم و اہلِ دانش کے مشورے سے چلاتی رہیں ۔ یوں ان کے دورِ حکمرانی میں بالعموم اسلامی اصول و ضوابط کی پابندی رہی ۔ تاہم حدیث مذکور کی بناء پر ایک خلش ان کے اندر پھر بھی موجود رہی جس کا حل مولانا تھانویؒ نے مذکورہ توجیہ کے ذریعے سے پیش کیا ہے ۔

یہ اُن کی ایک تاویل اور توجیہ ہی ہے جس کے علماء پابند نہیں ہیں ۔ تاہم اسے کسی درجے میں تسلیم کر لیا جائے تب بھی اسے صرف اسی دائرے اور حالات میں رہ کر ہی تسلیم کیا جا سکتا ہے ، جو مولانا تھانوی کے پیشِ نظر تھے ۔

اور یہ حالات موجودہ حالات سے یکسر مختلف ہیں جس کے وجوہ درج ذیل ہیں ۔

سابقہ ریاستوں میں سے کسی ریاست کی سربراہ بننے کے لئے کسی عورت کو گھر سے باہر نکل کر سیاسی جلسوں ، جلوسوں ، انتخابی مہم اور دیگر بے شمار سرگرمیوں میں حصّہ لینے کی ضرورت پیش نہیں آئی ۔ گھر بیٹھے ہی موروثی طور پر ان کو حکمرانی مل گئی ۔ جب کہ موجودہ سربراہِ حکومت (محترمہ بے نظیر بھٹو) کو اس کے لئے جو پاپڑ بیلنے پڑے ، جو کھکھیڑیں مول لینی پڑی ہیں اور جس جاں گسل انتخابی مہم سے انہیں گزرنا پڑا ہے ، وہ محتاجِ وضاحت نہیں ہے یہ ساری سرگرمیاں اسلامی اصول اور ضابطوں کے خلاف ہیں ۔ اس میں مردوں سے بے باکانہ اختلاط بھی ہے ، اپنی آواز اور شخصیّت کا جادو بھی جگانا ہے، اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ نمایاں بھی کرنا ہے اور اپنے جسمانی حُسن کی نمائش بھی کرنا ہے ۔ سوال یہ ہے کہ کیا اسلام کی رُو سے ایک مسلمان عورت کے لئے یہ تمام

کام جائز ہیں؟ اگر یہ ناجائز ہیں اور یقیناً ناجائز ہیں تو پھر اسے کسی ریاست کی حکمران عورت پر کس طرح قیاس کیا جا سکتا ہے جسے مذکورہ ناجائز کاموں میں سے کوئی بھی کام کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی ۔

علاوہ ازیں دونوں میں فرق اس سے بھی واضح ہے کہ مسلمان ریاست کی حکمران والیہ کبھی کسی بیرونی دورے پر بھی نہیں گئی ۔ غیر ملکی سفیروں سے ملنے کی ضرورت بھی اسے لاحق نہیں ہوئی اور ہر کہ ومہ سے ملنے کا اہتمام بھی اس نے کبھی نہیں کیا ۔ جب کہ اس وقت صورتِ حال اس سے بالکل مختلف ہے ۔ ہماری وزیراعظم کو بیرونی دوروں پر بھی جانا پڑے گا ۔ غیر ملکی سُفراء اور رجال سے ملاقاتیں بھی ہو رہی ہیں ۔ اور ہر ایک سے ملنے کا اہتمام بھی ہے ۔ اس صورت میں اسلامی اصول و تعلیمات کی جو مٹی پلید ہو رہی ہے اور ہو گی، وہ کس سے مخفی ہے؟ پھر آخر دونوں کو یکساں کس طرح سمجھا جا سکتا ہے؟

بنیادی استدلال اور بیانِ علّت میں خامی

ان سب سے بڑھ کر مولانا تھانوی کا بنیادی، استدلال اس نقطے پر ہے کہ عدمِ فلاح (ناکامیابی) کی علّت نقصانِ عقل ہے جس کا انجبار (ازالہ) جمہوری حکومت میں مشورۂ رجال سے ہو جاتا ہے اور یُوں اس علّت کے مُرتفع ہو جانے کی وجہ سے عورت کی حکومت نقصان دِہ نہیں رہتی ۔

لیکن یہ نقطۂ نظر بھی سخت محل نظر ہے ۔ نقصانِ عقل کو علّت فرض کر کے مشورۂ رجال سے اس کا انجبار ہی صحیح نہیں ہے ۔ حدیث رسُول لن یفلح قوم الحدیث میں کوئی علّت بیان نہیں کی گئی ہے، اس لئے اپنے طور پر ایک علّت فرض کر کے اس کی بنیاد پر صغریٰ کبریٰ ملا کر ایک نتیجہ اخذ کرنا کوئی صحیح طرزِ عمل نہیں ہے ۔ اس دور کے متجددین کی روش بھی یہی ہے کہ وہ فرضی علّتیں تلاش کر کے شریعتِ اسلامیہ کے منصوص احکام میں تبدیلیوں کی گنجائش نکالنے کی مذموم سعی کرتے ہیں ۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ مولانا تھانوی کی مذکورہ فقاہت ۔کے ڈانڈے بھی متجددین سے جا ملتے ہیں ۔

اس عدمِ فلاح کی اصل علّت کیا ہے؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے تاہم اس کی کوئی نہ

کوئی علّت اگر تلاش کرنی ہی ہے تو زیادہ قرینِ قیاس علّت تو اس کی یہ معلوم ہوتی ہے کہ اسلام نے مرد و عورت کی جداگانہ فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے جو الگ الگ ایک دوسرے سے مختلف ان کا دائرہ عمل تجویز کیا ہے تاکہ دونوں اپنے اپنے مقصدِ تخلیق کو پورا کریں ۔ عورت کی سربراہی اس فطری نظام سے بغاوت ہے، اور جو قوم فطرت کے نظام سے بغاوت کر کے عورت کو سربراہِ کار بنائے گی ، یقیناً وہ فوز و فلاح سے ہمکنار نہیں ہو گی ۔ کیونکہ

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملّت کے گناہوں کو معاف

اگر محض نقصانِ عقل کو علّت تسلیم کیا جائے تو پھر تو زیر بحث فرمانِ رسولؐ کی ساری اہمیت ہی ختم ہو جاتی ہے ۔ کیونکہ دنیا میں کوئی بھی حکمران (چاہے بادشاہ ہی ہو) مشاورت کے بغیر نہ حکومت کرتا ہے اور نہ حکومت چلا ہی سکتا ہے ۔ بادشاہی نظام میں بھی مشاورت کا اہتمام ہوتا ہے ۔ پھر تو مولانا تھانویؒ کو "جمہوری حکومت" کی قید لگانے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی ہے ۔ کیونکہ اپنے اپنے انداز میں مشاورت کا اہتمام تو ہر حکومت میں ہوتا ہے قرآن کریم سے بھی یہ نُکتہ واضح ہے کہ ملکۂ سبا نے بھی حضرت سُلیمان علیہ السّلام کی طرف سے خط آنے کے بعد اعیانِ حکومت سے مشورہ طلب کیا تھا ۔ لیکن اس مشورۂ رجال کے باوجود اسے حضرت سلیمان علیہ السّلام کی تابعداری اختیار کرنی پڑی تھی ۔ اور یہ مشورۂ رجال اسے عدمِ فلاح (ناکامیاب ہونے) سے بچا نہیں سکا ۔

ملکۂ سبا کے اس پہلو (مشورۂ رجال) کی وضاحت کے باوجود جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا کہ

"وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہو گی جس نے ایک عورت کو اپنا سربراہ بنا لیا"۔

تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اس کی علّت یہ ہرگز نہیں ہے کہ عورت ناقص العقل ہے بلکہ اس کی اصل علّت نظامِ فطرت سے بغاوت ہے ۔ جو قوم بھی اس نظامِ فطرت سے بغاوت کرے گی ۔ وقتی طور پر چاہے کچھ کامیابی بھی حاصل کر لے، تاہم حقیقی فوز و فلاح سے وہ محروم ہی رہے گی ۔

مولانا تھانویؒ کی تاویل بھی ہمارے لئے چنداں مُفید نہیں

بالفرض اگر تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم کر لیں کہ لن یفلح الحدیث کی علّت نقصانِ عقل ہے جس کا انجبار مشورۂ رجال سے ہو جاتا ہے ۔ تب بھی سوچنے والی بات یہ ہے کہ کیا ہمارے ہاں کی صورتِ حال بھی ایسی ہی ہے؟ ہمارے ملک کے حکمران کیا جمہوری مزاج رکھتے ہیں یا نقصانِ عقل کا اعتراف کرتے ہیں ۔ یہاں تو عقلِ کُل ہونے کا دعویٰ اور غرّہ ہے ۔ یہاں تو مرد بھیگی بلّی بنے ہوئے ہیں، مشورہ دینا تو کجا کسی کو اُس بُتِ طنّاز کے سامنے مجالِ دم زدنی نہیں ہے ۔ وہ خود کسی سے مشاورت کی ضرورت سمجھے تو اور بات ہے ورنہ کسی بھی مرد کو مشورہ دینے کی جرأت و ہمّت نہیں ۔ بنابریں حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جمہُوریّت کا صرف نام ہے ۔ ورنہ یہاں ہر جمہوری حکمران بد ترین آمر ہی ثابت ہوا ہے ۔اور محترمہ کے تیور اَور کس بل بھی اسی بات کے غماز ہیں کہ وہ بھی جمہوریت کے معاملے میں اپنے پیش رؤوں سے مختلف ثابت نہیں ہوں گی ۔

بلاشبہ برطانیہ وغیرہ میں صحیح معنوں میں جمہوریت قائم ہے اور وہاں جمہوری اقدار و روایات کی پاسداری کا پورا اہتمام ہے، وہاں تمام ادارے اپنی اپنی جگہ مستحکم اور فعّال ہیں ۔ عدلیہ ۔ انتظامیہ ۔ مُقنِنّہ اور صحافت اپنے اپنے دائرے میں آزاد اور مؤثّر ہیں ۔ ایسے ملک میں وزیرا عظم یقیناً آمرانہ اختیارات نہیں رکھتا اور اس کی حیثیت ایک مشیر سے زیادہ نہیں ۔ اصل اختیارات کی مالک وہاں کی کابینہ ہے ۔ وزیرا عظم اس کے مشورے اور رائے کے بغیر کوئی اہم اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے ۔ ایسے ملک میں اگر وزیرا عظم عورت ہو تو شاید وہاں وقتی طور پر اس کے وہ نقصانات ظاہر نہ ہوں جن کی طرف حدیث زیر بحث میں اشارہ کیا گیا ہے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ مسز تھیچر عورت ہونے کے باوجود وہاں بظاہر قدرے کامیاب ہے ۔ کیونکہ مطلق العنان اختیارات سے وہ محروم ہے جس سے بقول مولانا تھانویؒ عدمِ فلاح کی علّت مرتفع ہو گئی ہے ۔ لیکن ہمارے ہاں صُورت حال اس کے بالکل برعکس ہے ۔ یہاں جمہوری اقدار و روایات

کی پاسداری ہے ۔ نہ جمہوری ادارے مستحکم و فعال ہیں اور نہ برسرِاقتدار آنے والے حکمران اور پارٹیاں جمہوری مزاج کی حامل ہیں ۔ اس قسم کے ملک میں عورت کی حکمرانی بالخصوص اپنے اندر خطرات کے وہ تمام پہلو رکھتی ہے جن سے حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم میں انتباہ کیا گیا ہے ۔ اس لئے ہمیں اس حدیثِ رسولؐ کی صداقت پر پورا یقین ہے اور ہم پُورے اذعان سے یہ کہتے ہیں کہ اسلام کے اصول کو پامال کرتے ہوئے جس طرح ایک عورت کی حکمرانی کو قبول کر لیا گیا ہے، یہ ملک و ملّت کے لئے ہرگز نیک فال نہیں ہے ۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ نے ملکۂ سبا کے مشاورتی کردار سے بھی استدلال کیا ہے لکین جیسا کہ ہم پہلے عرض کر آئے ہیں کہ ملکۂ سبا مُشرکہ اور کافرہ تھی، اس کا کوئی بھی عمل و کردار ہمارے لئے حجّت نہیں ۔ اس لئے مولانا تھانویؒ کے اس نکتے کو ہم نے نظرانداز کر دیا ہے کیونکہ اس پر بحث ہو چکی ہے تاہم استدلال کی یہ سطحیت مولانا تھانویؒ کے کلام میں دیکھ کر سخت تعجب ہوا ۔ اللہ تعالی ان کی یہ لغزش معاف فرمائے ۔

مولانا تھانویؒ کا تضاد یا رجُوع؟

یہاں تک لکھا جا چکا تھا کہ اچانک مولانا تھانویؒ کی تفسیر "بیان القرآن" دیکھنے کا خیال آیا، تو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ مولانا تھانویؒ نے اپنی تفسیر میں ملکۂ سبا کے قرآن کریم میں ذکر کرنے سے عورت کی حکمرانی کے جواز پر جو استدلال کیا جاتا ہے، اسے غلط قرار دیا ہے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

"ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے، پس بلقیس کے قصّے سے کوئی شبہ نہ کرے ۔ اولّ تو یہ فعل مشرکین کا تھا ۔ دوسرے اگر شریعتِ سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ، تو شرع محمدیؐ میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے وہ حجّت نہیں"۔ (تفسیر بیان القرآن، پارہ ۱۹ ۔ ص ۷۴، ج۸، طبع مجتبائی ۔ دہلی ۱۳۴۶ھ)

مولانا تھانویؒ کا مذکورہ فتویٰ ۱۳۳۰ھ۔ کا ہے جب کہ تفسیر اس کے ۴ سال بعد ۱۳۳۴ھ میں طبع ہوئی ہے ۔ جیسا کہ اس کے طبع اول میں یہ تاریخ طبع (مطبع مجتبائی دہلی) میں موجود ہے ۔

اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ مولانا تھانویؒ نے جو فتویٰ ۱۳۳۰ھ میں دیا تھا، اس کے بعد تفسیر میں اس کے برعکس اپنی رائے کا اظہار کر کے اس سے رجُوع فرما لیا تھا، کیونکہ اگر اسے رجوع نہیں کہا جائے گا تو یہ تضاد ہو گا ۔ تضاد کی بہ نسبت رجوع کہنا مولانا تھانویؒ کی شان کے انسب ہے ۔ واللہ اعلم بالصواب ۔

"بالغ رائے دہی" اور "جمہوریت"

بالغ رائے دہی کا اصول محض فریب ہے اور اس کے غیر عقلی ہونے میں تو کچھ شبہ ہی نہیں۔ اپنے لئے صحیح معنوں میں قابل حکمران چننے کی صلاحیت "ہجوم" میں کہاں ہوتی ہے۔ اچھے حکمران چننے کے لئے معاشرے کی اکثریت کا عاقل ہونا ضروری ہوتا ہے اور ایسی عقلمندی معاشروں میں طویل تربیت کے بعد ہی پیدا ہو سکتی ہے الغرض بالغ رائے دہی کا اصول ہشیار سیاست کاروں نے معاشرے کے حقوق چھیننے اور معاشرے کی خود خدمتی اور خود احتسابی قابلیتوں کو بتدریج زائل اور فنا کرنے کے لئے وضع کیا اور اس کا نام جمہوریت رکھا۔ جس پر بعد میں "عوامی جمہوریت" کی بھی چھاپ لگا دی گئی۔ چنانچہ ؎

"مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"

بالغ رائے دہی اگرچہ اس وقت حکمرانوں کے انتخاب کا طریقہ ہے لیکن اس کی اساس مقبولیت پر ہے۔ نہ کہ قابلیت، دیانت اور امانت کی شہرت پر۔ مقبولیت بھی کوئی بری شئ نہیں۔ بشرطیکہ اس کے ساتھ پختہ شعور و دیانت اور امانت جیسے اوصاف بھی شامل ہوں ۔ اور عام لوگوں کو ان کے اوصاف کی موجودگی کا یقین ہو بالغ رائے دہی میں یا تو روپیہ رائے کو خریدتا ہے یا جوش انگیز اشتعال ۔ ان دونوں صورتوں میں اچھے حکمرانوں کا دستیاب ہونا ممکن نہیں البتہ یہ طریقہ آسان ضرور ہے اور اس کے ذریعے عوام کو بھی آسانی کے ساتھ یہ فریب دیا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت میں برابر کے شریک ہیں۔

(ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم)

حضرت اُمّ ورقہؓ بنت نوفل کے واقعے سے

استدلال کی حقیقت

ایک اور واقعے سے استدلال کیا جا رہا ہے جو حدیث کی بعض کتابوں میں درج ہے اور وہ واقعہ ہے حضرت اُمّ ورقہ بنتِ نوفل کا ۔ یہ واقعہ پیپلزپارٹی نے انتخابی مہم کے دوران اپنے ایک شائع کردہ پمفلٹ میں بھی ڈاکٹر حمید اللہ (آف فرانس) کے لیکچروں کے مجموعے "خطباتِ بہاول پور" کے حوالے سے شائع کیا تھا ۔ لیکن اس میں خاصی کتربیونت سے کام لیا ۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے "خطبات بہاولپور" کا متعلقہ حصّہ قارئین ملاحظہ فرمالیں ۔ اس سے پیپلزپارٹی کے اُس استدلال کا سارا پول ازخود ہی کھل جائے گا جو اس نے سیاق و سباق سے کاٹ کر کیا تھا ۔ چنانچہ ملاحظہ ہو ۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب سے سوال کیا گیا: اُمّ ورقہ کون تھیں؟ کیا صرف وہی حافظہ تھین یا جناب اُمّ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی حافظۂ قرآن تھیں؟

اس کے جواب میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے فرمایا ۔

حضرت اُمّ ورقہ کے متعلق لکھا ہے کہ جنگِ بدر (۲ھ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینے سے روانہ ہوئے تو انہوں نے اپنی خدمات پیش کیں کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلیں ۔ میں اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنا چاہتی ہوں ۔ ان کے متعلق ایک اور روایت ہے جو اس سے بھی زیادہ عملی یا علمی دشواریاں پیدا کرے گی ۔ وہ یہ کہ حضرت امِ ورقہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا جیسا کہ سُنن ابی داؤد اور مسند احمد بن حنبل میں ہے اور یہ بھی کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے ۔ اور یہ کہ ان کا مؤذن ایک مرد تھا ۔ ظاہر ہے کہ مؤذن بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہو گا ۔

(خطبات بہاول پُور ۔ ص ۲۶ ۔ مطبوعہ اسلام آباد)

ڈاکٹر صاحب کی اس سلسلے میں مزید گفتگو اور پیپلز پارٹی کا اس سے استدلال نقل کرنے سے پہلے ہم مناسب سمجھتے ہیں، کہ نفسِ حدیث پر گفتگو کر لی جائے ۔ یہ روایت مسند احمد اور سُنن ابی داؤد وغیرہ میں موجود ہے ۔ البتہ اس میں خط کشیدہ الفاظ نہیں ہیں ۔ بلکہ پہلے خط کشیدہ الفاظ کی جگہ اُمَرِّضُ مَرْضَاکُمْ کے الفاظ ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ میں بیماروں کی تیمارداری، یا زخمیوں کی مرہم پٹی کروں گی ۔ اسی طرح روایت میں یہ الفاظ بھی نہیں ہیں کہ:۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ نے انہیں ایک مسجد کا امام مامور فرمایا تھا اور یہ کہ ان کے پیچھے مرد بھی نماز پڑھتے تھے۔"

حدیث کے الفاظ یہ ہیں:۔ فاستاذنت النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلّم ان تتخذ فی دارہا مؤذنا فاذن لہا ۔

جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اُمّ ورقہ کو ان کی خواہش کے مطابق جنگ پر لے جانے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے بلکہ ان سے یہ فرمایا ۔ قِرِیْ فی بیتِکِ (تم اپنے گھر میں ہی رہو) تب انہوں نے نبی صلی اللہ علہ وسلم سے اپنے گھر میں ایک مؤذن رکھنے کی اجازت طلب فرمائی اور آپؐ نے انہیں ایسا کرنے کی اجازت عنایت فرما دی ۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں:۔

وجعل لہا مؤذنا یؤذن لہا و امرہا ان تؤم اھل دارہا (ابوداؤد ۔ کتاب الصلوٰۃ باب امامتہ النساء)

"نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے ان کے لئے ایک مؤذن مقرر فرما دیا جو ان کے لئے اذان دیا کرتا تھا اور آنحضرتؐ نے حضرت اُم ورقہؓ کو حکم دیا کہ اپنے گھر والوں کی امامت کرایا کرے"۔

اسی روایت میں موذن کے بارے میں بھی صراحت موجود ہے کہ وہ ایک "شیخ کبیر" بہت بوڑھا آدمی تھا ۔ یہ روایت سنن ابی داؤد کے علاوہ "صحیح ابن خُزیمہ" (ج ۳ ۔ ص ۸۹) "سنن دار قطنی" (ج ۱ ص ۴۰۳) مستدرک حاکم (ج ۱ ۔ ص ۲۰۳) اور مسند احمد (ج ۶، ص ۴۰۵) میں موجود ہے ۔

لیکن ایک تو یہ روایت سند کے لحاظ سے مضطرب ہے ۔ دوسرے اس میں کہیں بھی وہ خط کشیدہ الفاظ نہیں ہیں جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی عبارت میں ہیں ۔ تیسرے

محدثین نے اسے جس باب کے تحت ذکر کیا ہے، اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بھی اس سے یہی بات اخذ کی ہے کہ اس میں صرف ایک عورت کے عورتوں کی امامت کا بیان ہے ۔ یہ نہیں ہے کہ ایک عورت نے مردوں کی امامت یا کسی مسجد کی امامت کرائی ہے ۔ چنانچہ سنن ابی داؤد میں یہ روایت باب امامتہ النساء میں ، سنن دار قطنی میں باب صلاۃ النساء جماعۃً میں ، صحیح ابن خُزیمہ میں باب امامتہ المرأۃ النساء فی الفریضتہ میں اور مستدرک حاکم میں امامتہ المرأۃ النساء فی الفرائض میں بیان ہوئی ہے جس سے صرف یہی بات ثابت ہو سکتی ہے کہ ایک عورت، عورتوں کی فرائض میں امامت کر سکتی ہے ۔ جیسا کہ حضرت اُمّ ورقہ امامت کراتی رہی ہیں ۔ اس حدیث میں کہیں بھی ایسے الفاظ نہیں ہیں جن کا یہ مفہوم نکل سکتا ہو کہ حضرت ام ورقہ کسی مسجد کی امامت کرایا کرتی تھین یا ان کے پیچھے عام مرد بھی نماز پڑھا کرتے تھے ۔ زیادہ سے زیادہ اگر کوئی کچھ کہہ سکتا ہے تو یہ کہ موذن اور ایک مُدبَّر غلام ان کے پیچھے نماز پڑھتے ہوں گے ۔ اگرچہ ان کی نماز پڑھنے کی صراحت بھی حدیث میں موجود نہیں ہے تاہم قرائن کی رُو سے زیادہ سے زیادہ ان دو مردوں کی بابت کہا جا سکتا ہے کہ وہ شاید ان ہی کے پیچھے نماز پڑھتے ہوں گے ، جس سے صرف یہ استدلال ہو سکتا ہے کہ گھر کے افراد اس قسم کی مخصوص صورت میں عورت کے پیچھے نماز پڑھ سکتے ہیں ۔ محلّے کے عام مردوں کا عورت کے پیچھے نماز پڑھنے کا جواز اس سے پھر بھی نہیں نکل سکتا ۔

بلاشبہ عربی زبان میں ''دار'' کا لفظ ''بیت'' سے زیادہ وُسعت رکھتا ہے اور ''دار'' کو حویلی یا محلّے کے مفہوم میں لیا جا سکتا ہے، مؤذّن مقرر کرنے سے بھی اس مفہوم کی تائید نکلتی ہے ۔ تاہم اس کے باوجود یہ ماننا سخت مشکل ہے کہ حضرت اُمّ ورقہؓ کے پیچھے حویلی یا محلّے کے عام مرد بھی نماز پڑھتے ہوں گے، بلکہ اس سے زیادہ سے زیادہ یہ ثابت ہوتا ہے کہ حویلی یا محلّے کی دوسری خواتین بھی حضرت اُمّ ورقہ کے پیچھے آکر نماز پڑھتی ہوں گی ۔

اس حدیث سے پھر بھی یہ قطعاً ثابت نہیں ہوتا کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی عام مساجد میں امام بن سکتی ہیں اور پھر اس رَدّے پر ایک اور رَدّہ یہ چڑھا دیا جائے کہ جب عورت مسجد میں مردوں کی امام بن سکتی ہے تو پھر ملک کی سربراہ بھی بن سکتی ہے ایسا دعویٰ بنائے فاسد علی الفاسد ہی کہلائے گا ۔

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی توجیہہ اور ایک عملی مثال

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب جنہوں نے "دار" کے لفظ کی وسعت کے پیش نظر حضرت اُمّ ورقہؓ کو ایک مسجد کا امام قرار دیا ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک استثنائی صورت ہو سکتی ہے ۔ ورنہ عام حالات میں ایک عورت مردوں کی امام نہیں بن سکتی ۔ چونکہ اس موقعے پر پیپلزپارٹی ڈاکٹر صاحب کی عبارت کو سیاق و سباق سے کاٹ کر اپنے مطلب کے لئے استعمال کر رہی ہے ۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی توجیہہ اور ان کا وہ موقف جو حدیثِ اُمّ ورقہؓ کی روشنی میں انہوں نے اختیار کیا ہے، اسے انہی کے الفاظ میں پیش کر دیا جائے ۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:۔

"یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عورت کو امام بنایا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس حدیث کے متعلّق یہ گمان ہو سکتا ہے کہ یہ شاید ابتدائے اسلام کی بات ہو اور بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کر دیا ہو ۔ لیکن اس کے برعکس یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اُمّ ورقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ تک زندہ رہیں ۔ اور اپنے فرائض سرانجام دیتی رہیں اس لیے ہمیں سوچنا پڑے گا ۔ ایک چیز جو میرے ذہن میں آئی ہے وہ عرض کرتا ہوں کہ بعض اوقات عام قاعدے میں استثناء کی ضرورت پیش آتی ہے ۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے استثنائی ضرورتوں کے لئے یہ استثنائی تقرر فرمایا ہو گا ۔ چنانچہ میں اپنے ذاتی تجربے کی ایک چیز بیان کرتا ہوں ۔ پیرس میں چند سال پہلے کا واقعہ ہے ۔ ایک افغان لڑکی طالب علم کے طور پر آئی ۔ ہالینڈ کا طالب علم جو اس کا ہم جماعت تھا ۔ اُس پر عاشق ہو گیا ۔ عشق اتنا شدید تھا کہ اس نے اپنا دین بدل کر اسلام قبول کر لیا ۔ ان دونوں کا نکاح ہوا ۔ اگلے دن وہ لڑکی میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ بھائی صاحب میرا شوہر مسلمان ہو گیا ہے اور وہ اسلام پر عمل بھی کرنا چاہتا ہے لیکن اسے نماز نہیں آتی ۔ اور اسے اصرار ہے کہ میں خود امام بن کر نماز پڑھاؤں ۔ کیا وہ میری اقتداء میں نماز پڑھ سکتا ہے ؟ میں نے اُسے جواب دیا کہ اگر آپ کسی عام مولوی صاحب سے پوچھیں گی تو وہ کہے گا کہ یہ جائز نہیں ۔ لیکن میرے ذہن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طرزِ عمل کا

ایک واقعہ حضرت ام ورقہ رضی اللہ تعالی عنہا کا ہے، اس لئے استثنائی طور پر تم امام بن کر نماز پڑھاؤ ۔ تمہارے شوہر کو چاہیئے کہ مقتدی بن کر تمہارے پیچھے نماز پڑھے اور جلد از جلد قرآن کی ان سورتوں کو یاد کرے جو نماز میں کام آتی ہیں ۔کم از کم تین سورتیں یاد کرے اور تشہد وغیرہ یاد کرے ۔ پھر اس کے بعد وہ تمہارا امام بنے اور تم اس کے پیچھے نماز پڑھا کرو ۔ دوسرے الفاظ میں ایسی استثنائی صورتیں جو کبھی کبھار اُمت کو پیش آ سکتی تھیں، ان کی پیش بندی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ انتخاب فرمایا تھا ۔ شاید اس واقعے کی یہ وجہ ہو (خطبات بہاولپور ص ۲۶۔۲۷)

یہ اس واقعے کی نہایت معقول توجیہہ ہے جو خود ڈاکٹر صاحب موصوف نے بیان فرما دی ہے ۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء ۔

برلن (جرمنی) کاایک عبرت آموز واقعہ

"ترک حضرات کی ایک مسجد میں میرا خطاب رکھا گیا۔ لیکن خطاب سے قبل میں ایک غیر متوقع صورت سے دوچار ہوگیا۔ ایک ترک بھائی نے باآواز بلند سوال کیا

" آپ لوگ ہمیں یہاں تبلیغ کرنے کیوں آئے ہیں جب کہ آپ کے اپنے ملک میں تبلیغ کی زیادہ ضرورت ہے جہاں ایک عورت کو حکمرانی کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے"

یہاں کے ایک مقامی اخبار نے پاکستان میں نومبر ۱۹۸۸ء کے انتخابات کے بعد یہ سرخی لگائی تھی:

" خدا کے مقابلے میں ایک عورت کامیاب ہوگئی "

صد حیرت ہے کہ کتاب و سنت کے نام پر قائم ہونے والا یہ ملک قرآن و سنت کی تعلیمات سے روگردانی کے باعث کب تک مسلمانوں کی جگ ہنسائی کا باعث بنتا رہے گا"

(مولانا صہیب حسن صدر قرآن سوسائٹی لندن (برطانیہ) کے سفرنامہ برلن سے ایک اقتباس از "اردو ڈائجسٹ" لاہور۔ جولائی ۱۹۸۹ء، ص ۱۳۴)

علّامہ اقبال کی ایک تقریر سے استدلال

پیپلزپارٹی کی طرف سے شائع کردہ پمفلٹ میں علامہ اقبال کی ایک تقریر کے اقتباسات بھی ان کے فرزند جاوید اقبال کی تصنیف "زندہ رود" سے نقل کئے گئے ہیں، لیکن نقل میں صریح بددیانتی کا ارتکاب کیا گیا ہے ۔ بعض ایسے فقرے تو لے لے گئے ہیں جن سے مرد و زن کی اُس مساوات کی تائید ہو جو یورپ کے مغربی نظام میں ہے لیکن وہ تمام فقرے حذف کر دیئے گئے ہیں، جن سے مغربی نظریۂ مساواتِ مرد و زن کی نفی ہوتی ہے، حالانکہ علامہ اقبال کی اُس تقریر میں مردوزن کے درمیان شہری حقوق میں مساوات کی بات کہی گئی ہے ۔ جو فی الواقع اسلام کے مطابق ہے ۔ لیکن جہاںتک فرائض کا تعلّق ہے ، وہ دونوں کے الگ الگ ہیں، جسے علامہ اقبال نے بھی تسلیم کیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ۔

"عورت بحیثیت عورت اور مرد کے بحیثیت مرد، بعض خاص علیحدہ علیحدہ فرائض ہیں، ان فرائض میں اختلاف ہے، مگر اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ عورت ادنیٰ ہے اور مرد اعلیٰ ۔فرائض کا اختلاف اور وجوہ پر مبنی ہے ۔مطلب یہ کہ جہاں تک مساوات کا تعلق ہے، اسلام کے اندر مرد و زن مین کوئی فرق نہیں۔ تمدنی ضروریات کی وجہ سے فرائض میں اختلاف ہے۔" (زندہ رُود حصہ سوم ۔ ص ۳۵۸)۔

یہی وہ بات ہے جو علماء بھی کہتے ہیں، علماء بھی یہ نہیں کہتے کہ عورت ادنیٰ یا حقیر ہے، بلکہ اصل بات فطری صلاحیتوں اور اس کے مطابق الگ الگ فرائض کی ہے ۔ ان فطری صلاحیتوں کے اعتبار سے مرد کو ایک گونہ برتری حاصل ہے جس کا ذکر قرآن میں بھی کیاگیا ہے وللرجال علیھن درجۃ (البقرۃ) مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ برتری حاصل ہے) اس انتظامی برتری کی بنیاد پر حقوق میں مساوات کا انکار کرنا صحیح نہیں ہے ۔ نہ علماء اس کا انکار کرتے ہی ہیں ۔ اور یہ انتظامی برتری اختلافِ فرائض کا لازمی نتیجہ ہے ۔ اور یہ اختلافِ فرائض علامہ اقبال بھی تسلیم فرماتے ہیں ۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ علّامہ اقبال بھی عورت کی مساوات کے تو قائل ہیں، لیکن اسی دائرے میں جو اسلام کی رُو سے اسے حاصل ہے مغربی نظریۂ مساواتِ مرد و زن کے وہ بھی حامی

نہیں ہیں جس کی رُو سے مرد و عورت کے درمیان کوئی فطری فرق نہیں ہے ۔ اس لئے مغرب کے نزدیک دونوں کے حقوق جس طرح یکساں ہیں، فرائض بھی دونوں کے یکساں ہیں ۔

پمفلٹ مذکور میں علامہ اقبال کی بابت یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ وہ عورتوں کے لئے پردے کے قائل نہیں تھے ، لیکن علّامہ اقبال اپنی اس تقریر میں آگے چل کر فرماتے ہیں:۔

"دیکھنا یہ ہے کہ جن باتوں کو لفظی قیود سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ اپنی اصل میں قیود ہیں یا نہیں؟ پردے کے متعلق اسلام کے احکام واضح ہیں "غض بصر" کا حکم ہے اور وہ اس لئے کہ زندگی میں ایسے وقت بھی آتے ہیں جب عورت کو غیر محرم کے سامنے ہونا پڑتا ہے ۔۔۔ پردے کے سلسلے میں اسلام کا عام حکم عورت کو یہ ہے کہ وہ اپنی زینت کو ظاہر نہ کرے" (زندہ رود ج ۳ ص ۳۵۹)

فرمائیے! اس اقتباس میں مسلمان عورت کے لئے پردے کی تاکید ہے یا اسے نعوذ باللہ عورتوں کے لئے "قید" سے تعبیر کیا گیا ہے؟ جس طرح کہ پمفلٹ مذکور میں باور کرایا گیا ہے ۔

اقبال کے نزدیک سوشلزم اور مغربی جمہوریت

دونوں مردود ہیں

پھر علامہ اقبالؒ کے کلام سے استشہاد کرنے والوں کو یہ بھی معلوم ہے ؟ کہ علاّمہ کے نزدیک بالشویک، کمیونسٹ یا سوشلسٹ عقیدہ رکھنا دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے مترادف تھا ۔

(زندہ رُود ۔ ج ۳ ۔ ص ٦٥٩)

اسی طرح اقبال "مغرب کے سیکولر جمہوری نظام" کے بھی حامی نہیں تھے ۔ بلکہ ان کے نزدیک ۔

"کسی بھی پس ماندہ ملک میں، جس کے عوام زیادہ تر اَن پڑھ، غیر منظم اور فاقہ کش ہوں، وہاں جمہوریت کا تعارف، سیاسی ابتری، معاشی تباہی، قومی انتشار اور ملک کے ٹوٹنے کا سبب بن سکتا ہے" (زندہ رُود ۔ ج ۳ ۔ ص ٦٦١)

کلامِ اقبال کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کرنے والے اقبال کے مذکورہ واضح اور دوٹوک موقف کو ماننے کے لئے اور اس کی روشنی میں اپنے منشور اور نظریات کا جائزہ لینے کے لئے تیار ہیں؟!

---

۱ ۔ مسلمان عورت کے بارے میں اقبال کے نقطۂ نظر کی مزید وضاحت ایک مستقل عنوان کے تحت اسی کتاب میں شامل ہے ۔

مقصدِ تخلیق اور دائرۂ کار کی وضاحت، توہین و تذلیل نہیں

۱۱ ۔ دسمبر ۱۹۸۸ء کے "جنگ" میں احمد ندیم قاسمی صاحب نے فرمایا ہے کہ عورت کی سربراہی کو موضوعِ بحث بنا کر لوگ اپنی ہی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی مذمت کر رہے ہیں ۔

احمد ندیم قاسمی اونچے درجے کے شاعر، ادیب اور اہلِ قلم ہیں ۔ لیکن مذکورہ ارشاد میں انہوں نے سطحیت کا مظاہرہ بھی کیا ہے ۔ اور مسلمان عورتوں کو گمراہ کرنے کی مذموم سعی بھی ۔ حالانکہ اس بحث سے مقصود عورت کی مذمت اور اہانت قطعاً نہیں ہے ۔ بات صرف فطری صلاحیّتوں اور اسلام کے اصول و ضوابط کی ہے، اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ بہادر ہے، تو اس میں عورت کی تذلیل و اہانت کا کوئی پہلو نہیں ہے ۔ کیونکہ یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے جو مرد و عورت کے درمیان فطری فرق و صلاحیت پر مبنی ہے ۔ اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے کہ مرد و عورت کا دائرہ کار بھی الگ الگ اور ایک دوسرے سے مختلف ہے ۔ عورت کا دائرہ عمل گھر کی چاردیواری ہے جب کہ بیرونی سرگرمیاں مرد کے دائرۂ عمل میں داخل ہیں، تو یہ بھی ایک حقیقت کا ہی اظہار ہے جو دونوں کے درمیان صلاحیتوں اور دونوں کے جداگانہ مقصد تخلیق پر مبنی ہے ۔ آج بھی یورپ میں فوج کے تمام جرنیل مرد ہیں ۔ کیوں؟ جب کہ وہاں ہر شعبے میں مرد و زن کے درمیان کامل مساوات تسلیم کی جاتی ہے تمام پائلٹ مرد ہیں ۔ بیشتر کلیدی مناصب پر مرد ہی فائز ہیں ۔ کیا ان کا یہ رویہ عورت کی تذلیل و اہانت پر مبنی ہے؟ نہیں یقیناً نہیں ۔ بلکہ کامل مساوات کا دعویٰ کرنے کے باوجود وہ مردوں کی برتری کو قائم کئے ہوئے ہیں، کیونکہ یہ فطرت کا نظام اور اس کا عین تقاضا ہے ۔ جسے خواہش کے باوجود بدلا نہیں جا سکتا ۔ اس لئے اسلام جب یہ کہتا ہے کہ عورت بیرونی سرگرمیوں سے مجتنب رہے ۔ تو یہ بات فطرت کے عین مطابق اور اس کا تقاضا ہے ۔ علاوہ ازیں اسلامی تعلیمات کا بھی عین اقتضاء ہے ۔ کیونکہ اس نے مرد و عورت کے اختلاط کو سخت ناپسند کیا ہے اور اس کے لئے اس نے بہت سی پابندیاں عائد کی ہیں ۔ اس لیے اسے عورت کی توہین قرار دینا سخت بددیانتی ہے ۔ یا اسلام پر حرف گیری ۔ اور ہم ان دونوں باتوں سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں ۔

پروفیسر اسلم صاحب کے جواب میں

۱۳ دسمبر ۱۹۸۸ء کے ہفت روزہ "ندا" لاہور میں پروفیسر محمد اسلم صاحب استاذ شعبۂ تاریخ جامعہ پنجاب کا ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے یہ "فتویٰ" صادر فرمایا ہے کہ عورت کے حکمران بننے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے ۔ اور "دلیل" یہ ارشاد فرمائی ہے کہ تاریخ میں فلاں فلاں عورتیں حکمران رہی ہیں ۔ اور نہایت کامیابی سے انہوں نے حکومت کی ہے ۔ اس لئے یہ مانے بغیر چارہ نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان صرف فارس کی بوران دخت نامی عورت کے لئے تھا ۔ آپؐ کا یہ فرمان بطور اصول اور کُلیے کے نہیں تھا ۔ ورنہ آپؐ کی صداقت مشکوک ٹھہرے گی (یہ ان کے سارے مضمون کا خلاصہ ہے) ۔

پروفیسر صاحب نے مضمون کے آغاز میں پہلے تو اس بات پر اظہار افسوس فرمایا ہے کہ آج قرنِ اول کے برعکس جس کا جی چاہتا ہے ، ہر کس وناکس فتویٰ صادر کرنا شروع کر دیتا ہے ۔ حالانکہ ہمارے ہاں وفاقی شرعی عدالت، اسلامی نظریاتی کونسل اور ادارۂ تحقیقات اسلامی موجود ہیں ۔ اور ان اداروں کی موجودگی میں کسی فردواحد یا خود ساختہ مفتی کو فتویٰ جاری کرنے کا حق نہیں پہنچتا ۔ اس ضمن میں انہوں نے یہ دعویٰ بھی فرمایا کہ سیدنا عمر فاروقؓ کے عہدِ خلافت میں چند عالم صحابہ کے علاوہ کسی کو فتوی دینے یا حدیث بیان کرنے کی ممانعت تھی ۔

حضرت عمرؓ کے عہد کی بابت جو دعویٰ کیا گیا ہے، وہ تو خلافِ واقعہ ہے (جس کی تفصیل کی اس وقت گنجائش نہیں) تاہم یہ بات نہایت تعجب انگیز ہے کہ جن علماء کی ساری عمر قرآن و حدیث کی تعلیم و تدریس اور افتاء و ارشاد میں گزری ہے وہ تو "کس و ناکس" اور "خود ساختہ مفتی" قرار پائے ہیں، جنہیں فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور خود موصوف جو تاریخ کے پروفیسر ہیں اور شاید عربی زبان سے بھی نابلد ہیں ۔ وہ مذکورہ اداروں کی موجودگی میں بھی "فتویٰ" صادر کرنے کے مجاز ٹھہرے ہیں اور ان کے مضمون کا عنوان ہی ایک مکمل فتویٰ ہے کہ :۔

" عورت کے حکمران بننے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے"

گویا

تمہاری زلف میں پہنچی تو حُسن کہلائی
وہ تیرگی جو مرے نامۂ سیاہ میں ہے

اس تضاد یا دو عملی پر ہم سوائے اس کے کیا عرض کریں

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

دوسری بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب موصوف کے "الواح الصنادید" اور سفرنامے قسم کے مضامین پڑھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ انہیں بزرگوں کے ساتھ بڑی عقیدت ہے لیکن اس مضمون سے معلوم ہوا کہ ان کو ساری عقیدت فوت شدہ بزرگوں سے ہے، زندہ بزرگوں سے نہیں ۔ کراچی کے جن ۱۵ ۔ اکابر علماء نے عورت کی سربراہی کے عدمِ جواز کا فتویٰ دیا ہے ۔ اختلاف مسلک کے باوجود علم و فضل ، اپنی دینی خدمات اور زُہد و تقویٰ کے لحاظ سے نہایت برگزیدہ اور سربرآوردہ بزرگ ہیں ۔ لیکن پروفیسر صاحب نے ان کے ہم مسلک ہونے کے باوجود ان مفتیانِ کرام کا ذکر انتہائی تمسخر و استہزاء کے انداز میں کیا ہے ۔ بقول غالب

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تُو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

تیسری بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے فارس کی حکمران عورت پُوران دخت کا سالِ حکمرانی ۶۴۹ء بتلایا ہے جب کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا سالِ وفات ۶۳۳ء ہے ۔ پروفیسر صاحب نے غور نہیں فرمایا کہ کیا یہ عورت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ۱۶ سال بعد حکمران بنی تھی؟ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے عدمِ فلاح کی خبر کس طرح دی؟ کیا یہی وہ تاریخ دانی ہے جس کی بنیاد پر ایک صحیح اور مسلّمہ حدیث کی تکذیب کی سعی کی جا رہی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کی یہ ایک غلطی ہی ان کی ساری تاریخ دانی کا بھرم کھول دیتی ہے اور ان کی تاریخی مثالوں کو مشکوک بنا دیتی ہے

قیاس کن زگلستانِ من بہار مرا

پروفیسر صاحب کی "درایت" کا جائزہ

بہرحال اب پروفیسر صاحب کی اُس "درایت" پر ہم غور کرتے ہیں جس کی بنا پر انہوں نے مفتیانِ کرام کی رائے کو "سہو" پر مبنی قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

"ان مُفتیوں کو حدیثِ مبارکہ کا مفہوم سمجھنے میں سہو ہوا ہے۔ اس حدیث کا جائزہ لینے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق صرف ایران کی ملکہ پُوران دخت پر ہوتا ہے اور اسے بوجُوہ قاعدہ کلیہ نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ درایت مفتیوں کے فتویٰ کی تائید اور تصویب نہیں کرتی"۔

اس کے بعد انہوں نے اس "درایت" کی تفصیل روس کی ملکہ کیتھرائن ، برطانیہ کی ملکہ وکٹوریا اور دیگر بعض حکمران عورتوں کی مثالیں دے کر بیان کی ہے کہ یہ سب عورتیں نہایت کامیاب حکمران رہی ہیں، اس لیے ان پر عدمِ فلاح کا اطلاق نہیں ہو سکتا، بنابریں حدیثِ زیر بحث کو اگر کلیہ کے طور پر منوانے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت غیر معتبر ٹھہرے گی، کیونکہ تاریخ سے اس کے برخلاف عورتوں کی کامیاب حکمرانی کی مثالیں ثابت ہیں ۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جو مثالیں دی گئی ہیں ۔ وہ زیادہ تر دورِ ملوکیت کی دی گئی ہیں ۔ جس کو ہمارے جمہُوریت مآب حضرات تسلیم ہی نہیں کرتے ۔ بالخصوص اسلامی تاریخ کی جو مثالیں (رضیہ سلطانہ، چاند بی بی اور شاہجہاں بیگم رئیسہ ریاست بھوپال) دی گئی ہیں ، وہ سب ملوکیت کے نتیجے میں برسراقتدار آئی تھیں، جو ایک تو اضطرار کا نتیجہ تھا کہ خاندان میں اس وقت کوئی اہل مرد نہیں تھا مسلمان شاہی خاندان میں اہل مردوں کی موجودگی میں کہیں بھی کسی عورت کو سربراہ نہیں بنایا گیا ہے ۔جیسا کہ خود پروفیسر صاحب موصوف نے بھی تسلیم کیا ہے کہ:۔

"رضیہ سُلطانہ کے بیس بھائیوں کی موجودگی میں اس کا درویش صفت باپ سلطان شمس الدین التمش یہ کہا کرتا تھا کہ اس کے بیٹے نکمّے اور نااہل ہیں اور اس کی بیٹی نظمِ مملکت چلانے کی پوری طرح اہل ہے"

("ندا" ۱۳ دسمبر ۱۹۸۸ء)

کیا سلطان التمش کے اس تبصرے سے، جسے خود پروفیسر صاحب نے نقل فرمایا ہے ، ثابت نہیں ہوتا کہ رضیہ سلطانہ کا اقتدار بطور اضطرار اور بہ امر مجبوری تھا ۔ بیجاپور اور احمد نگر دکن کی حکمران عورت چاند بی بی کا اقتدار بھی اسی قسم کی اضطراری صورت حال کا نتیجہ تھا ۔ چاند بی بی بیجاپور کے حکمران علی عادل شاہ کی ملکہ تھی ۔ عادل شاہ ایک سازش کے تحت ہلاک کر دیئے گئے، ان کے کوئی اولاد نرینہ نہ تھی ۔ وارثوں میں صرف ایک بھتیجا تھا، جس کی عمر ۹ سال تھی، اسی کو وارثِ تخت بنا دیا گیا اور چاند بی بی اس کی نگران مقرر ہوئی ۔ چاند بی بی ایک مرتبہ اپنے باپ حسین شاہ کی ریاست احمد نگر آئی تو وہاں اس کا اکلوتا بھائی ذہنی امراض کا شکار ہو گیا ۔ مجبوراً یہ ریاست بھی چاند بی بی کو سونپ دی گئی اور وہ بیجاپور اور احمد نگر کی مشترکہ حکمران بن گئی ۔

(ملخّص از اُردو دائرہ معارف اسلامیہ ۔ شائع کردہ دانش گاہ پنجاب، ج ۷، ص ۶۱۳-۶۱۴)

والیۂ بھوپال کا معاملہ بھی اضطراری ہے جس کی مختصر تفصیل یہ ہے کہ بھوپال کے چھٹے حکمران نواب وزیر محمد خان کے بیٹے نظر محمد خان نے ۱۸۱۶ء میں جانشین بنتے ہی انگریزوں سے ایک معاہدہ کیا ۔ جس کی رُو سے انگریزوں نے یہ ذمّہ داری قبول کی کہ ریاست بھوپال کا علاقہ اس کے اور اس کی اولاد کے لئے محفوظ رہے گا ۔ اور اُس دوسرے خاندان میں یہ سلسلہ منتقل نہیں ہو گا جو ریاست کی حکمرانی کا اُمیدوار تھا اور جس کے بعض افراد اس سے قبل ریاست کے حکمران بھی رہ چکے تھے ۔ نیز ایک موقع پر ان دونوں خاندانوں میں باہمی جنگ اور خون ریزی بھی ہو چکی تھی ۔

۔۔۔ اس کے صلے میں نواب نظر محمد خان نے بطور والی ریاست بھوپال بعض انگریزی مفادات کے تحفظ کا وعدہ کیا ۔

اس معاہدے کی رُو سے اب ریاست کی حکمرانی صرف اسی ایک خاندان میں محصور ہو گئی جس نے انگریزوں سے معاہدہ کیا تھا، اور اس مجبوری کی وجہ سے پھر اولاد نرینہ نہ ہونے کی صورت میں سکندری بیگم ، شاہجہان بیگم اور سلطان جہاں بیگم بالترتیب حکمران بنیں ۔ پھر جب سلطان جہاں بیگم کے ہاں اولادِ نرینہ ہوئی تو ان کے لڑکے نواب حمید اللہ خان کو ریاست کا ولی عہد قرار دیا گیا ۔

اس مقام پر یہ بات بھی خاص طور پر نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ نواب سکندری بیگم کے بعد جب ان کی غیر شادی شدہ صاحبزادی شاہجہاں بیگم کو مسند نشینِ ریاست

تسلیم کیا گیا تو بایں الفاظ ان کو اطلاع دی گئی کہ

"موافق رسم بھوپال کے نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ کی مسند نشینی اُسی طرح منظور ہوئی جس طرح کہ آپ باتفاق رؤساء و اُمراء بھوپال و رضامندی سرکار انگلشیہ مسند نشین ریاست کی گئی تھیں ۔ جس وقت شاہجہاں بیگم کتخدا (شادی شدہ) ہوں گی، اُن کا شوہر رئیس ہو گا"۔ (حیاتِ شاہجانی ص ۴) ۔

پھر جب موصوفہ شادی کی عمر کو پہنچی اور خاندان میں موزوں اور مناسب رشتے کی تلاش شروع کی گئی تو حکمران خاندان کو کوئی رشتہ پسند نہیں آیا ۔ اور مجبوراً دوسرے خاندانوں میں رشتے کی تلاش شروع ہوئی اور کچھ رشتے پسند کئے گئے، ابھی کسی ایک کے بارے میں حتمی فیصلہ بھی نہیں کیا گیا تھا کہ اس سے قبل ہی انگریز گورنمنٹ کو ریاست کی طرف سے حسب ذیل درخواست پیش کی گئی کہ:۔

"خاندان میں نواب شاہجہاں بیگم کی شادی کے لائق کوئی نظر نہیں آتا اور جب غیر خاندان میں شادی ہو گی تو نہ معلوم انجام کیا ہو؟ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریاست نواب شاہجہاں بیگم کے نام رہے، اُن کا شوہر اُمور ریاست میں بے اختیار ہو، صرف مرتبہ و نام و عزت میں نواب رہے مگر اُن سے جو اولاد ہو وہ مستقل نواب اور مالک قرار پائے " (حیات شاہجہانی ص ٦ مطبوعہ آگرہ ۔ ۱۹۱۴ء مؤلفہ سلطان جہاں بیگم) ۔

چنانچہ انگریز گورنمنٹ نے اس سے اتفاق کر کے اس کے مطابق عملدرآمد کی یقین دہانی کرائی اور فی الواقع اس کے مطابق ہی عمل ہوا ۔ اس لحاظ سے گویا بیگماتِ بھوپال کی حکمرانی اضطرار دَر اضطرار کا نتیجہ قرار پاتی ہے ۔

علاوہ ازیں بیگماتِ بھوپال کی مثالیں دینے والوں کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ ان بیگمات نے حکمرانی کے باوجود پردے تک کی پابندی سختی کے ساتھ کی تھی ۔ بلکہ سلطان جہاں بیگم نے پردے کی حمایت میں ایک پُرزور کتاب بھی لکھی ہے جس کا نام "عفت المسلمات" ہے جس میں پردے کے شرعی احکام، بے پردگی کے نقصانات اور بے پردگی کی حمایت میں پیش کئے جانے والے دلائل کا دندان شکن جواب دیا ہے (ملاحظہ ہو تذکرہ بیگمات بھوپال" ص ۷۷۔۸۷۔، دارالاشاعت لاہور ۱۹۳۲ء) کیا بیگماتِ بھوپال کا نام لینے والے اپنی حکمران بیگمات کو بھی پردے کی تاکید فرمائیں گے؟

ایوب خان کے دَور مین محترمہ فاطمہ جناح کے صدارتی امیدوار نامزد کرنے سے بھی استدلال کیا جا رہا ہے ۔ لیکن واقفانِ حال اور خلوتیانِ راز جانتے ہیں کہ ان کی نامزدگی بھی ۔ سن و سال کے علاوہ اضطراری صورتِ حال ہی کا نتیجہ تھی ۔ چونکہ پروفیسر صاحب نے اپنے مضمون میں اس مثال کا ذکر نہیں کیا ہے ۔ اس لئے ہم بھی فی الحال اس کی ضروری تفصیل سے گریز کر رہے ہیں، علاوہ ازیں اس پر ضروری بحث گزر بھی چکی ہے ۔

بہرحال اسلامی تاریخ کے گزشتہ چودہ صدسالہ دور میں عورت کی حکمرانی کی بعض ریاستی دائروں میں جو چند مثالیں ملتی ہیں ان سب کی حکمرانی کسی نہ کسی "اضطرار" پر مبنی تھی اور کسی بھی اضطراری صورت سے عام نارمل حالات کے لئے استدلال کرنا صحیح نہیں کیوں کہ مسلّمہ اصول ہے الضرورات تبیح المحظورات "بعض (اضطراری) ضرورتیں ممنوعات کو بھی جائز کر دیتی ہیں"۔ گویا مذکورہ مثالیں آج کل کی اصطلاح کے مطابق نظریۂ ضرورت کی پیداوار تھیں ، جنہیں عام حالات میں بطور مثال اور نمونہ پیش نہیں کیا جاسکتا ۔

دوم : پروفیسر صاحب نے جتنی بھی مثالیں اپنوں اور غیروں کی پیش کی ہیں، زمانۂ حال کی چند مثالوں سے قطع نظر، سب کی سب دور ملوکیت کی ہیں، یعنی وہ عورتیں وراثتہً شاہی حکومتوں اور ریاستوں کی حکمران بنی تھیں، جن میں عوام کی رائے کا کوئی دخل نہیں تھا ۔ سوال یہ ہے کہ یہ جو لوگ آج عورت کی حکمرانی کا جواز چند ملوکانہ مثالوں سے کشید کر رہے ہیں ۔کیا وہ ملوکیت کے جواز یا استحسان کے قائل ہیں؟ اگر نہیں ہیں تو پھر ان کے لئے ان مثالوں سے استدلال کرنے کا جواز کیا ہے؟

رہ گئی مثالیں زمانۂ حال کی، جیسے اندرا گاندھی ، مسز بندرانائیکے اور مسز گولڈا میئر وغیرہ ۔ یہ مثالیں یقیناً عصرِ حاضر کی ہیں ۔لیکن واقعہ یہ ہے کہ "دُور کے ڈھول سہانے" کے مصداق پروفیسر صاحب کو ان کا دَور بڑا کامیاب نظر آیا ہے ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان "نیلم پریوں" کی جمہوری قبا میں دیوِ استبداد ہی پائے کوب رہا ہے ۔ اندرا گاندھی کا دور محض اس لئے کامیاب نہیں قرار دیا جا سکتا کہ اس کے دور میں ہمیں ہزیمت کا داغ برداشت کرنا پڑا تھا ۔ کیونکہ اس میں اس کے ناخنِ تدبیر کی گرہ کشائی سے زیادہ ہماری اپنی حماقتوں ، کوتاہیوں اور بعض طالع آزماؤں کی حد سے زیادہ اقتدار پسندی کا دخل

تھا۔ اندرا کا دور ابھی زیادہ پرانا نہیں ہوا ہے۔ ذرا اہل ہند سے اس کی کامیابیوں کی کارگزاریاں جا کر سن لیں اور پھر اس کی کامیابی یا ناکامی کا فیصلہ کریں۔

سوم: روس و برطانیہ اور دیگر ملکاؤں (۱) کے ادوارِ حکومت کو بھی جو نہایت کامیاب بتلایا گیا ہے، وہ بھی خلافِ واقعہ ہے، موصوف نے صرف تصویر کا ایک ہی پہلو سامنے رکھا ہے، اُمید ہے کہ دیگر اہل علم و اہل تاریخ ان ملکاؤں کے اَدوار حکومت کی پوری تفصیل اہلِ ملک کے سامنے پیش کریں گے جس سے ان کے "روشن اور کامیاب" اَدوار کی حقیقت سامنے آجائے گی۔

ہمارے سامنے تو اسلامی تاریخ کے جو دو نمونے رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی کے ہیں، انہیں عبرت انگیز ہی کہا جا سکتا ہے۔ کامیاب کسی طرح بھی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اوّل الذکر کی حکمرانی کو اس کی ریاست کے اکثر اُمراء نے ہی تسلیم نہیں کیا۔ رضیہ سلطانہ نے انہیں زیر کرنے کی کوشش کی مگر ان کے ہاتھوں شکست کھاتی رہی۔ داروغۂ اصطبل یاقوت حبشی کو دیا جانے والا "امیرالامراء" کا خطاب اس کے لئے مزید مصیبت بن گیا۔ باآلاخر اس نے ایک بہادر حاکم اختیار الدین التونیہ سے شادی کر کے اپنا اقتدار تسلیم کرانا چاہا مگر وہ اس میں بھی کامیاب نہ ہوئی اور باآلاخر التونیہ اور رضیہ دونوں کو قتل کر دیا گیا۔ (اُردو دائرہ معارف اسلامیہ ج۱۰، ص ۳۱۰۔۳۱۱۔ شائع کردہ دانش گاہ پنجاب لاہور۔ و تاریخ عالم اسلام، مؤلفہ محمد عبداللطیف انصاری۔ الموتمر الاسلامی کراچی ص ۱۴۶)

ثانی الذکر کو بھی مسلسل بغاوت اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور باآلاخر اپنی فوج کے باغی سپاہیوں کے ہاتھوں ماری گئی۔ (دائرہ معارف اسلامیہ، ج ۷ ص ۶۱۴)۔

البتہ بھوپال کی بعض بیگمات بالخصوص شاہجہاں بیگم کا دَورِ حکومت قدرے کامیاب قرار دیا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بلاشبہ قانوناً ریاست کی حکمران یہی بیگمات تھیں۔ لیکن ایک تو ان بیگمات نے شریعت کی پابندی سختی کے ساتھ برقرار رکھی، حتیٰ کہ پردے تک سے انحراف نہیں کیا، دوسرے، اسی شرعی پردے کی پابندی کی وجہ سے اپنے اختیارات کا استعمال وہ زیادہ تر اپنے دیندار مشیروں اور خاوندوں کے

---

(۱) پروفیسر صاحب کو اسی برطانیہ کی ملکہ میری کا ذکر "فلاح" کے سلسلے میں کرنا چاہیئے تھا جس کو تاریخ نے "خونی میری" (Bloody Mary) قرار دیا ہے۔ اسی طرح مصر کی ملکہ کلوپیٹرا کو سامنے رکھنا چاہیے تھا جس کے حجلۂ تعیش میں روم کے مرد آہن سیزر اور پھر انٹونی داد عیش دیتے رہے اور ملکہ سمیت ہلاکت کو پہنچے (ع۔ن)

ذریعے سے کرتی رہی ہیں ۔ شاہجہان بیگم کے شوہر اول (نواب امراء الدولہ باقی محمد خان) کی وفات تو شاہجہان بیگم کی تخت نشینی سے قبل ہی ہو گئی تھی، لیکن جب ان کا دوسرا نکاح والا جاہ نواب سیّد صدیق حسن خان سے ہوا ۔ تو نواب صاحب کے ذریعے سے ہی زیادہ اختیارات کا استعمال ہوا ۔ چنانچہ چند تصریحات اس ضمن میں پیش ہیں ۔ "مآثر صدیقی" کے مصنف لکھتے ہیں:۔

"رئیسہ عالیہ (شاہجہاں بیگم) احکامِ شرع متین کے مطابق ایک پردہ نشین خاتون تھیں اور وسیع رقبۂ مملکت پر حکمران اور کثیر التعداد مخلوق کے سیاہ و سفید کی مالک تھیں ۔ اس لئے ضروری تھا کہ ان کے دست و بازو ایسے مُشیرانِ ریاست اور عمّالِ متدین ہوں جو آغاز دَور جدید میں اپنی خداداد قابلیت اور دیانت و تدبر اور خداترسی اور خدا پرستی سے حسنِ انتظامِ ریاست و ترقی مالیات ، سرسبزی ملک ، رفاہِ خلق ، تہذیب اخلاق رعایا اور ازدیادِ مراتب ریاست میں کافی امداد و اعانت کر سکیں"۔

اور اُن کے شوہر والا جاہ نواب صدیق حسن کے متعلق مُصنف مذکور لکھتے ہیں:۔

"والا جاہ مرحوم ریاست بھوپال میں نہ صرف وزیر بااختیار کی حیثیت رکھتے تھے بلکہ رئیسۂ عالیہ کی اصل منشا اور احکامِ گورنمنٹ برطانیہ کی تصریح کے مطابق جن کا حال مطالعۂ واقعات سے ظاہر ہو گا وہ اپنی تجویز و مشورہ سے رئیسۂ عالیہ کے صدورِ حکم کے بعد تمام کُلًّا و جُزءاً انتظامی اور اصلاحی اُمورِ ریاست انجام دیتے تھے" (مآثر صدیقی، حصہ سوم، ص ۲، طبع نول کشور لکھنو ۔ ۱۹۲۴ء)

بلکہ نواب سیّد صدیق حسن خان پر جو الزامات لگائے گئے تھے جن کی بنا پر انگریزوں نے ان کے تمام خطابات و اعزازات سلب کر لئے تھے، ان میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ انہوں نے رئیسہ عالیہ شاہجہاں بیگم کو اپنے حبالۂ عقد میں لینے کے بعد پردہ نشین بنا کر ریاست کے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں ۔ (مآثر صدیقی جلد ۳+ ص ۷۳ و "نواب صدیق حسن خان" مؤلفہ ڈاکٹر رضیہ حامد، ص ۱۱۶، طبع بھوپال ۱۹۸۳ء)۔

پروفیسر صاحب نے اہلحدیث علماء سے نواب صدیق حسن خانؒ کا فتویٰ طلب فرمایا ہے ۔ لیکن ہم عرض کریں گے کہ نواب صاحب کا مذکورہ کردار ان کے کسی فتویٰ سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے عملًا والیۂ ریاست شاہجہان بیگم کے اختیاراتِ

حکمرانی خود اپنے ہاتھ میں لے لئے تھے ۔ یقیناً اس میں وہی خیال و رائے کارفرما ہو گی جس کی رُو سے عورت کا مقصدِ تخلیق سربراہیٔ ریاست سے مختلف ہے ۔ اور اگر موصوف کو فتویٰ پر ہی اصرار ہے تو پروفیسر صاحب الرجال قوامون علی النساء اور آیت وللرجال علیھن درجۃ کی تفسیر میں ان کی عربی تفسیر "فتح البیان" اور اُردو تفسیر "ترجمان القرآن" ملاحظہ فرما لیں جہاں انہوں نے مرد کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے حدیث لن یفلح قوم ولوا امرہم امرأۃ کا بھی حوالہ دیا ہے۔(۱)

"فلاح" محض ظاہری خوشحالی کا نام نہیں ہے

چہارم: پروفیسر موصوف نے "فلاح" کا مفہوم صرف ظاہری خوش حالی ہی سمجھا ہے حالانکہ "فلاح" کا مفہوم اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے ۔ نیز اس کا تعلّق ظاہر سے کہیں زیادہ باطن سے ہے ۔ ظاہری خوش حالی کے باوجود ایک قوم "ناکامیاب" قرار دی جا سکتی ہے ۔ یورپی حکومتیں اکثر ظاہری لحاظ سے نہایت آسودہ حال ہیں ۔ سیاسی و اقتصادی استحکام بھی انہیں حاصل ہے لیکن اس کے باوجود عورت کی بے قید آزادی اور ہر شعبۂ زندگی میں مرد و عورت کے دوش بدوش والے نظریے نے جس طرح جنسی انارکی پورے معاشرے میں پیدا کر دی ہے اور عائلی نظام کو جس بُری طرح برباد کیا ہے ۔ کیا مادی خوش حالی اور دنیاوی آسائشوں کی فراوانی اس کا بدل کہلا سکتی ہے؟ اور جس قوم کا عائلی نظام تباہ ہو چکا ہو ، بڑھتے ہوئے جرائم نے ہر شخص کو وہاں خوف زدہ کر رکھا ہو ۔ اور جنسی ہیجان انگیزی نے وہاں تمام اخلاقی قدروں کو پامال کر دیا ہو ۔ کیا اُس قوم اور معاشرے کو کامیاب (فلاح یافتہ) کہا جا سکتا ہے؟ اگر نہیں کہا جا سکتا اور یقیناً نہیں کہا جا سکتا تو کسی بھی دَور کی محض ظاہری خوش حالی اور چمک دمک سے اسے "کامیاب" قرار نہیں دیا جا سکتا ۔ عام لوگ تو آج بھی یورپی قوم اور معاشرے کو بڑا "کامیاب" باور کراتے ہیں۔ لیکن الحمدللہ اہلِ نظر اور باخبر اہل علم کبھی اس مغالطے کا

---

(۱) پروفیسر صاحب کو اگر نواب صاحب مرحوم کا فتویٰ و عمل پسند ہے تو انہیں چاہیئے کہ وہ "اپنی موصوفہ" وزیراعظم کے خاوند سے گزارش کریں کہ وہ آگے بڑھے اور نظامِ سلطنت کو اپنے ہاتھ میں لے کر دکھائیں (ع ۔ ن)

شکار نہیں ہوئے ۔ وہ خوش حالی کے اس ساکن سمندر کی تہہ میں موجود خطرناک موجوں اور اس کی ہلاکت خیزیوں سے آگاہ ہیں ۔ وہ مادی خوش حالی کو کامیابی نہیں سمجھتے، اخلاقی اقدار کی سربلندی اور قلب و نظر کی عفّت و پاکیزگی کو کامیابی سمجھتے ہیں ۔ اور وہ خوف اور دہشت سے بھرپور معاشرے کو کبھی "فلاح یاب" ماننے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے ۔

ظاہری خوش حالی بطور "استدراج" بھی ہو سکتی ہے

پنجم: قرآن کریم اور فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بات واضح ہوتی ہے، کہ بعض دفعہ بطور استدراج قوموں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہ صرف مہلتِ عمل ملتی ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ان پر دنیاوی آسائشوں کے دروازے بھی کھول دیتا ہے جس طرح کہ حدیث میں ہے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تم یہ دیکھو کہ معصیت کاریوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی فرد یا قوم کو اس کی خواہش کے مطابق دنیاوی مال و دولت سے نواز رہا ہو، تو یہ استدراج (ڈھیل دینا) ہے پھر آپؐ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی فَلَمَّا نَسُوْا مَاذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتّٰى اِذَا فَرِحُوْا بِمَا اُوْتُوْا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَاهُمْ مُّبْلِسُوْنَ (الانعام) ۔ رواہ احمد ۔ (مشکوٰۃ کتاب الرقاق ۔ ص ۴۴۲) یعنی "جب وہ لوگ وہ سب باتیں بھلا بیٹھے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کھول دیئے ۔ یہاں تک کہ جب وہ ان چیزوں کو پا کر اترانے لگے تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا ۔ تب وہ بالکل ناامید ہو گئے"۔

اس لئے اللہ کی نافرمانیوں کے باوجود اگر کوئی فرد یا قوم ظاہری طور پر پھل پُھول رہی ہو تو جلد ہی یہ فیصلہ نہیں کر لینا چاہئیے کہ یہ فرد یا قوم تو بہت کامیاب ہے کیونکہ یہ وقتی ظاہری خوش حالی کامیابی کا معیار نہیں ۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اُس فرد یا قوم کے لئے مہلت عمل ہو، جس کی بابت نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مہلت کب ختم ہو جائے اور پھر وہ مواخذۂ الٰہی سے دوچار ہو کر نشانِ عبرت یا داستانِ پارینہ بن کر رہ جائے ۔

اس کی ایک اور مثال یہ سامنے رکھنی چاہئیے کہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ۔ یَمْحَقُ اللّٰہُ الرِّبٰو وَیُرْبِی الصَّدَقَاتِ (البقرہ ۔ ۲۷۶) "اللہ تعالی سود کو مٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے"۔ اس کے ظاہری مفہوم کی رُو سے ہونا تو یہ چاہئیے کہ سُودی کاروبار کرنے والے افراد اور قومیں مادی خوشحالی سے ہمکنار نہ ہوں ۔ لیکن ظاہر میں اس کے برعکس ہو رہا ہے ۔ سارے یورپ میں سُودی نظام ہے لیکن اس کے باوجود وہاں دولتِ دنیا (کم ہونے کی بجائے) خوب فراواں ہے ۔ ہمارے ملک میں بھی جو بڑے بڑے لوگ بنکوں سے سودی لین دین کرتے ہیں ۔ وہ سُود سے بچنے والوں کی نسبت زیادہ خوش حال ہیں کیا پروفیسر صاحب یہاں بھی اپنی "درایت" کا استعمال فرماتے ہوئے یہی ارشاد فرمائیں گے کہ واقعات سے قرآن کریم کے اس بیان کی تصدیق نہیں ہوتی ۔ لہٰذا قرآن کریم کی اس آیت کا تعلّق بھی صرف عہدِ رسالت کے اُس معاشرے سے ہی ہے جس میں قرآن کریم نازل ہوا تھا ، کیونکہ اگر اس کو بطور قاعدۂ کُلّیہ ہم لیں گے تو قرآن کریم کی تکذیب لازم آئے گی؟ یا موصوف یہاں اس بات کو تسلیم کریں گے کہ اللہ کے اس فرمان کا تعلق ظاہری بڑھوتری سے نہیں ہے بلکہ معنوی بڑھوتری اور روحانی برکت سے ہے ۔

ہم پروفیسر صاحب موصوف سے پوچھتے ہیں کہ یہاں ان کا موقف کیا ہے؟ کیا یہاں اُس "درایت" کا استعمال صحیح ہے جو آپ نے زیر بحث حدیث کے ردّ کرنے یا اسے محدود کرنے کے لئے استعمال فرمائی ہے یا آپ اس کی وہی توجیہ فرمائیں گے ۔ جو ہم نے علمائے کرام کی ہمنوائی کرتے ہوئے مذکورہ سطور میں پیش کی ہے؟ اگر آپ کو اپنی "درایت" کی صحت پر اصرار ہے تو پھر اس کی روشنی میں اس آیت کا مفہوم بھی واضح فرمائیے! اور اگر آپ یہاں معنوی فوز و فلاح اور رُوحانی برکت مراد لیتے ہیں تو یہی مفہوم حدیث لن یفلح قوم ولوا امرھم امرأۃ میں کیوں نہیں لیا جا سکتا؟ علاوہ ازیں اگر "فلاح" کا وہی مفہوم صحیح ہے جو پروفیسر صاحب کے ذہن میں ہے تو اس لحاظ سے تو خود پوران دخت کے دور کو بھی ناکام قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ اس کے دور میں بھی بظاہر عدمِ فلاح والی بات نظر نہیں آتی ۔ ۶ مہینے اس کی حکمرانی رہی، اور پھر ایک بیماری میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئی ۔ بیماری کی وجہ سے فوت ہونے کو ناکامی نہیں کہا جا سکتا ۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ نے اس قوم کے فلاح کی نفی فرمائی ہے تو یقیناً اس کے کچھ باطنی اور روحانی اثرات ایسے ہیں جن کا پورا اندازہ ظاہری پیمانوں سے نہیں کیا جا سکتا ۔

ایک قطعی الثبوت بات کو کسی مؤرّخ کے بیان سے

مشکوک نہیں ٹھرایا جا سکتا

ششم: کسی بھی دور کو کامیاب یا ناکامیاب قرار دینا اتنا آسان نہیں ہے ۔ جتنا پروفیسر صاحب نے سمجھ لیا ہے اور خواتین کے پیش کردہ ادوارِ حکومت کو کامیاب قرار دے دیا ہے ۔ موصوف سے زیادہ کون اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اہلِ تاریخ کے بیانات آپس میں مختلف اور متضاد ہوتے ہیں ۔ کوئی کسی عہد کو کامیاب قرار دیتا ہے تو کوئی اور اسی عہد کو ناکام بلکہ بد ترین باور کراتا ہے ۔ زیادہ دُور نہیں جائیے ۔ اپنی آنکھوں دیکھا دور ہی سامنے رکھ لیجئے ۔ کئی لوگ مصر کے جمال عبدالناصر کو اسلام کا "بطل جلیل" کہتے ہیں ۔ جب کہ کئی دوسرے اسے اسلام کا دشمن قرار دیتے ہیں ۔ کئی لوگ صدر ایّوب خان کے دَور کو زرّیں دَور باور کراتے ہیں اور کئی دوسرے اس کے برعکس رائے رکھتے ہیں ۔ یہی معاملہ جنرل ضیاء الحق اور جناب بھٹو کے عہد ہائے حکومت کا ہے ۔

اس کے کئی اسباب ہیں، بعض دفعہ مؤرخین کے اپنے ذہنی رجحانات و نظریات ہوتے ہیں جو تاریخ میں راہ پا جاتے ہیں اور بعض دفعہ بعد میں برسرِ اقتدار آنے والے حکمرانوں کے مخصوص مفادات اور پروپیگنڈا اس میں اثر انداز ہوتا ہے ۔ بعض دفعہ کچھ اور اسباب اس میں کارفرما ہوتے ہیں ۔ اس لئے کسی بھی تاریخی بیان کو سو فی صد صحیح نہیں سمجھا جا سکتا ۔ اور نہ اس کی بنیاد پر کسی قطعیّ الثبوت بات کو ردّ کیا جا سکتا ہے ۔

کیا موصوف کو پتہ نہیں کہ بنو اُمیہ کا دورِ حکومت (بہ حیثیتِ مجموعی) تاریخ اسلام کا بہترین دَور ہے ۔ لیکن مسلم مؤرخین نے اسے کس طرح مسخ کیا ہے؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر مورّخین کے بیانات اتنے ہی صحیح اور مقدس ہیں کہ ان کی بنیاد پر قرآن و حدیث کے مسلّمات بھی مشکوک قرار پا جائیں تو پھر موصوف کو دور اموی کو بھی تاریخ کا بد ترین دور باور کر لینا چاہیئے ۔ جس طرح کہ ہمارے اکثر مؤرخین یہی کچھ باور کراتے

ہیں ، موصوف بنی اُمیّہ کے بارے میں مؤرخین کے مبیّنہ تأثر کے برعکس کیوں رائے رکھتے ہیں؟ اگر بنو اُمیہ کے بارے میں مؤرخین کی رائے کا تجزیہ کر کے ان کو غلط کہا جا سکتا ہے تو کیا ان مؤرخین کی رائے کی تغلیط و تردید نہیں کی جا سکتی ۔ جنہوں نے خلافِ واقعہ مذکورہ خواتین کے عہدہائے حکومت کو کامیاب قرار دیا ہے؟

استثنائی صورتوں سے اصُول اور کُلیہ نہیں ٹوٹتا

ہفتم: یہ مسلّمہ بات ہے کہ اصول و کلّیات میں بھی استثنائی صورتیں ہوتی ہیں اور ان سے اصُول اور کلّیہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ کلّیہ عموم اور اکثریت کی بنیاد پر ہوتا ہے ۔ اس لئے بعض استثنائی صورتوں سے وہ متأثر نہیں ہوتا ۔ مثلاً ایک مسلّمہ اصول اور کلّیہ ہے کہ مرد، عورت کے مقابلے میں زیادہ بہادر اور قوی ہے ۔ اس کلّیے کے برعکس اگر چند عورتیں نسبتاً مردوں سے زیادہ بہادر نکل آئیں، تو کیا لاکھوں اور کروڑوں مردوں میں سے ۱۰۔۲۰ عورتوں کے بہادر ہونے سے مردوں کی مردانگی و بہادری والا کُلّیہ ختم ہو جائے گا؟ نہیں، یقیناً نہیں ، اسی طرح اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ پروفیسر صاحب موصوف کی پیش کردہ حکمران خواتین بڑی کامیابی سے حکومت کرتی رہی ہیں، تب بھی ہزاروں اور لاکھوں مرد حکمرانوں کے مقابلے میں ان کامیاب خواتین کا تناسب ہی کیا ہے؟ اس لئے موصوف کی بات ماننے کے باوجود حدیثِ زیر بحث میں جو کُلّیہ حکمران عورتوں کی بابت بیان کیا گیا۔ وہ اپنی جگہ بالکل صحیح اور واقعات کے بالکل مطابق ہے ۔ چند عورتوں کی کامیاب حکمرانی سے یہ کُلیہ ختم نہیں ہو گا ۔ اگر اصول اور کُلیے اس طرح ٹوٹنے لگیں جس طرح موصوف نے اس کُلیے کے ٹوٹنے کا دعویٰ کیا ہے، تو پھر تو دنیا کا کوئی اصول اور کُلیہ بطور اصول اور کُلیہ کے باقی ہی نہیں رہے گا ۔ کیونکہ بیشتر اصول اور کُلیے ایسے ہی ہوتے ہیں جن میں استثنائی صورتیں بھی ہوتی ہیں لیکن اس کے باوجود کُلیوں کو کُلیہ ہی تسلیم کیا جاتا ہے ۔ بعض استثنائی صورتوں سے ان کے ٹوٹنے کا دعویٰ نہیں کیا جاتا ۔

عورت کی سربراہی قرآن و حدیث کی متعدّد نصوص اور اسلام کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے

ہشتم: پروفیسر صاحب نے سارا زور حدیثِ مذکور کو مشکوک بنانے یا اس کے معنوی مفہوم کے بدلنے پر صرف کیا ہے اور یہ سمجھ لیا ہے کہ اس کے بعد عورت کی سربراہی کا جواز ہر قسم کے شک و شبے سے بالا ہو گیا ہے ۔ حالانکہ موصوف کا ایسا سمجھنا اُس وقت تو صحیح ہو سکتا تھا جب کہ اس مسئلے میں حدیثِ مذکور ہی واحد نص ہوتی جب کہ واقعہ یہ ہے کہ عورت کی سربراہی و حکمرانی کا مسئلہ ایسا ہے کہ قدم قدم پر اس کا ٹکراؤ قرآن و حدیث کی واضح نصوص اور اس کی صریح تعلیمات سے ہوتا ہے ۔

مثلاً عورت کی حکمرانی اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ (النساء ـ ۳۴) "مرد عورتوں پر حاکم ہیں" کے خلاف ہے ۔

وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (البقرہ ـ ۲۲۸)

"مردوں کو عورتوں پر ایک لحاظ سے برتری حاصل ہے" سے متصادم ہے ۔

وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ (الاحزاب ۳۳)

"عورتیں اپنے گھروں میں رہیں" کی صریح خلاف ورزی ہے

قرآن نے مسلمان عورتوں کو پردے کی جو تاکید کی ہے، عورت کی حکمرانی سے اسلام کی اس بنیادی تعلیم کی مٹی پلید ہوتی ہے ۔

قرآن نے معاشی ذمّے داریوں کا کفیل صرف مرد کو بنایا ہے عورت کو اس سے مُستثنیٰ رکھا ہے ۔

قرآن نے یہ تصریح کر کے کہ ہم نے تمام نبی مرد ہی بنائے (الانبیاء) یہ واضح کر دیا ہے کہ امامت و قیادت کی قبا مردوں کے قامتِ زیبا پر ہی راست آتی ہے ۔

علاوہ ازیں دیگر دلائل شرعیہ کی رُو سے:۔

عورت ، مردوں کی امامت نہیں کر سکتی، کسی مسجد کی مؤذن یا خطیب نہیں ہو سکتی ۔

عورت کسی نکاح میں ولی نہیں بن سکتی ۔ حتی کہ خود اس کا اپنا نکاح بھی بغیر ولی کے صحیح نہیں ۔

خلوت میں کسی نامحرم مرد سے ملاقات نہیں کر سکتی ۔

عورت کو جہاد کی ذمّے داریوں سے مستثنیٰ رکھا گیا ہے ۔

عورت کو اپنی آواز تک کو کنٹرول کرنے کا حکم دیا گیا ہے ۔

کسی بھی موقعے پر مرد و عورت کے اختلاط اور بے محابا میل جول یا آپس میں بے باکانہ گفتگو کو پسند نہیں کیا گیا ۔ اور اس طرح کی بہت سی باتیں ہیں جن سے مرد و زن کی اُس کامل مساوات کی نفی ہوتی ہے جو مغرب کا نظریہ ہے ۔ اور جس پر عورت کی سربراہی کی اصل بنیاد قائم ہے ۔

کیا ان تعلیمات اور واضح تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک و شبہ باقی رہ جاتا ہے کہ ایک مسلمان مملکت میں کسی عورت کے سربراہ بننے کی شرعاً کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ اس لیے ہمارے ملک میں اب ایک محترمہ اس منصب پر فائز ہو گئی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب ایسا کرنا جائز ہو گیا ہے ۔ قطعاً نہیں، ہرگز نیہں ۔ بلکہ مسلمانوں کا عمل و کردار ایک الگ چیز ہے ۔ اور قرآن و حدیث کی تصریح ایک شے دیگر ہے ۔ مسلمانوں کے ایک غلط عمل کے اختیار کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اس غلط عمل کو سندِ جواز مل گئی ہے ۔ اس منطق کی رُو سے تو پھر تمام "منکرات" معروفات میں ، سیئات، حسنات میں ، اور محرمات، حلال میں تبدیل ہو جائیں گی ۔

بنابریں ہم سیاسی دانشوروں سے عرض کریں گے کہ اگر آپ کو "مغربی جمہوریت" کا یہ تحفہ اچھا لگتا ہے تو آپ یقیناً اسے پسند فرمائیں لیکن قرآن و حدیث کو بازیچۂ اطفال بنانے سے گریز فرمائیں ۔ اور پروفیسر اسلم صاحب سے بالخصوص عرض ہے کہ آپ نے اسلام کے ایک مُسلّمہ اصول کو مشکوک بنانے کے لئے جو سعی و کاوش فرمائی ہے اور جو دُور کی کوڑی آپ لائے ہیں، ہو سکتا ہے کہ بہت سے "دانشوروں" نے اس پر آپ کو خوب داد دی ہو، لیکن ہم اپنی گذشتہ گزارشات کے پیشِ نظر ان سے یہی عرض کریں گے

اے اہلِ نظر! ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شئی کی حقیقت کو نہ سمجھے، وہ نظر کیا

بعض غزوات میں بعض عورتوں کی شرکت سے استدلال

بعض لوگ اس سے بھی استدلال کرتے ہیں کہ عہد رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم میں عورتیں غزوات میں شریک ہوتی رہی ہیں جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عورتیں مردوں کے دوش بدوش سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے سکتی ہیں ۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ بعض غزوات میں بعض عورتوں کی شرکت ایک اتفاقی معاملہ تھا یعنی کسی وجہ سے بعض عورتیں اپنے خاوندوں یا بیٹوں یا دیگر عزیزوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں چلی گئیں ۔ جس سے ان کا مقصود زخمیوں کی مرہم پٹی، ستّو وغیرہ گھول کر پلانا اور تیر پکڑانا تھا ۔ اسلامی فوج کے ساتھ ان کی یہ شرکت اس اصول کا نتیجہ ہرگز نہیں تھی کہ عورتوں پر بھی جہاد مردوں کی طرح فرض ہے ۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر عورتوں کی شرکت کے اِکّے دُکّے واقعات ہی احادیث و سِیَر کی کتابوں میں نہ ملتے بلکہ ہر غزوے میں مردوں کے دوش بدوش عورتوں کا ذکر بھی ہوتا نیز عورتوں کو بھی جہاد کی دعوت دی جاتی لیکن اہل علم جانتے ہیں کہ عام غزوات میں عورتیں شریک نہیں ہوئیں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عورتوں کو جہاد میں شریک ہونے کا کبھی حکم نہیں دیا ۔ بلکہ آپؐ نے تو اس کے برعکس انہیں جہاد کی بجائے گھر میں رہنے کی تاکید فرمائی ۔ بعض عورتوں نے اجازت مانگی تو آپؐ نے انہیں اجازت بھی نہیں دی ۔ جیسا کہ ورقہ بنتِ نوفل کا واقعہ پہلے گزر چکا ہے کہ انہوں نے جنگِ بدر میں شرکت کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی لیکن نبی صلّی اللہ علیہ وسلم نے اجازت نہیں دی ۔ اور فرمایا تم گھر میں ہی رہو ۔ اللہ تعالیٰ تمہیں وہیں شہادت سے ہمکنار فرمادے گا (اس کا حوالہ گزر چکا ہے) بعض اور عورتوں نے بھی جہاد میں شریک ہونے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو آپؐ نے ان کو یہ فرمایا کہ تمہارا جہاد حج ہے (صحیح بخاری)

علاوہ ازیں غزوۂ خیبر کے موقع پر آپؐ نے جب دیکھا کہ چھ عورتیں بھی لشکر میں شریک ہیں تو آپؐ نے اظہار ناراضی فرمایا اور ان سے پُوچھا مَعَ مَنْ خَرَجْتُنَّ وَبِاِذْنِ مَنْ خَرَجْتُنَّ "تم کس کے ساتھ آئی ہو اور کس کی اجازت سے آئی ہو؟ انہوں نے کہا ہم تو

صرف اپنے فوجی بھائیوں کی امداد کی نیّت سے آئی ہیں، ہم انہیں تیر پکڑا دیا کریں گی ۔ سَتّو گھول کر پلا دیا کریں گی اور ہمارے پاس کچھ دوائیں ہیں جو زخمیوں کے کام آ جائیں گی ۔ لیکن آپؐ نے انہیں اجازت نہیں دی، بلکہ انہیں واپس جانے کا حکم دیا اور وہ واپس چلی گئیں (سنن ابی داؤد، باب المرأة والعبد یحذیان من الغنیمۃ) ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم نے کبھی بھی عورتوں کو جہاد میں شریک ہونے کا حکم نہیں دیا ۔ اگر کسی غزوے میں وہ شریک ہوئی ہیں تو محض اپنے جذبے اور کسی اصول کے بغیر ہوئی ہیں ۔ تاہم غزوۂ خیبر کے موقعے پر اپنے طور پر شرکت سے بھی صریحاً منع فرما دیا ۔ چنانچہ آپؐ کی عورتوں کے بارے میں ان ہدایات کا نتیجہ ہم دیکھتے ہیں کہ عہدِ خیرالقرون اور مابعد ادوار میں کسی بھی اسلامی معاشرے میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش نظر نہیں آتیں ۔ بالخصوص سیاست و جہانبانی کا شعبہ عورتوں سے بالکل خالی رہا ہے ۔

اس لئے مذکورہ استدلال بھی اپنے اندر کوئی قوت نہیں رکھتا ۔

فوجی یا لیگی حکومتوں کا رویّہ کوئی شرعی دلیل نہیں

ایک استدلال یہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان مین شروع سے ہی عورتیں ہر شعبے میں مردوں کے دوش بدوش حصہ لیتی آ رہی ہیں ۔ اور ہر حکومت نے اس کی حوصلہ افزائی ہی کی ہے، چاہے وہ لیگی حکومت ہو یا فوجی ، اُس وقت یہ علماء کہاں تھے ؟ اور اب ایک عورت کا سربراہِ حکومت بن جانا کیوں ناجائز ہے؟

جہاں تک اس بات کا تعلّق ہے کہ ہر حکومت یہاں مغرب کے نظریۂ مساواتِ مردوزن کو فروغ اور اس کی ترویج کرتی رہی ہے بلاشُبہہ صحیح ہے حتیّٰ کہ جنرل ضیاء الحقؒ تک کے گیارہ سالہ دور میں یہ پالیسی نہ صرف برقرار بلکہ روز افزوں رہی ہے ۔ لیکن یہ کہنا کہ اُس وقت علماء کہاں تھے؟ وہ کیوں خاموش رہے؟ یہ تأثر خلافِ واقعہ ہے ۔

حقیقت یہ ہے کہ علماء نے ہر دور میں مذکورہ پالیسی کی مذمت ہی کی ہے اس پر خاموش نہیں رہے وہ اسے برابر ہدفِ تنقید بناتے رہے ہیں لیکن

کون سُنتا ہے فُغانِ درویش

کے مصداق ان کی آواز صدابصحراء ہی ثابت ہوتی رہی ہے ۔ اس لئے علماء کو مطعون کرنا صحیح ہے نہ گزشتہ حکومتوں کی پالیسیوں کو بطور حجت پیش کرنا دُرست ہے ، کیوں کہ ان کا عمل شرعی دلیل نہیں ہے اور علماء کی بابت یہ کہنا کہ وہ خاموش رہے ، واقعات کے خلاف ہے ۔

اسلامی اتحاد کی حکومت سے اپیل

بہرحال ہم پھر عرض کریں گے کہ قرآن و حدیث کی واضح نصوص کی رُو سے عورت کا دائرہ عمل گھر سے باہر نہیں ۔ صرف گھر کے دائرے تک محدود ہے ۔ اور عارضی اور اضطراری صورتوں کے علاوہ عورتوں کا ہر شعبۂ زندگی میں مردوں کے دوش بدوش حصّہ لینا کسی طرح بھی اسلامی تعلیمات سے مطابقت نہیں رکھتا ۔ حکومتوں کا عمل چاہے کچھ بھی رہا ہو، ان کی کج فکریوں کی وجہ سے اسلام کا مسلّمہ اصول نہیں ٹوٹ سکتا ۔ بنابریں ہم پنجاب میں اسلامی جمہوری اتحاد کی حکومت سے بالخصوص اپیل کریں گے کہ انہوں نے اسلام کے نام پر ووٹ حاصل کئے ہیں اور لوگوں نے بھی اسی نقطۂ نظر سے اسے پیپلزپارٹی کے مقابلے میں ووٹ دیئے ہیں ۔ اس لئے عہد کی پاسداری اور لوگوں کے جذبات کا تقاضا ہے کہ وہ کم از کم پنجاب میں عورتوں کے بارے میں از سر نو پالیسی وضع کرے اور اسے اسلامی اصُولوں پر استوار کرے اور مغرب کی پیروی و نقّالی سے اجتناب کرے ۔

علاوہ ازیں جب مسلمان عورتوں کی مجبوریوں کے پیش نظر قومی و صوبائی اسمبلیوں میں انہیں قومی و صوبائی ممبران کے ووٹوں کے انتخاب کے ذریعے سے ان کی نمائندگی کا حق دے دیا گیا ہے تو پھر انہیں بطور امیدوار کھڑا ہونے کا حق دینا کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے اس تضاد کو بھی جلد از جلد دور کرنے کی نیز آئین میں وزارتِ عظمیٰ و صدارت وغیرہ کلیدی مناصب کے لئے مسلمان مرد کی وضاحت کی بھی ضرورت ہے ۔ وماعلینا الاالبلاغ المبین ۔

حضرت پیر محبُّ اللہ شاہ راشدی حفظہ اللہ

کا مکتوبِ گرامی

حدیثِ ابی بکرہؓ کے ایک پہلو کی مزید وضاحت

راقم کا گزشتہ مضمون ، جو عورت کی سربراہی سے متعلّق شکوک و شبہات اور مغالطات کے ازالے پر مبنی تھا ۔ پڑھ کر ہمارے ملک کی ایک نہایت برگزیدہ علمی و فاضل شخصیّت جناب پیر محب اللہ شاہ صاحب (آف سندھ) نے ایک اور مغالطے کی طرف توجُّہ دلائی ہے جو کراچی کے اخبار "جنگ" کے مضمون میں پیش کیا گیا ہے ۔

ہم پیر صاحب دام فیوضہ کے ممنون ہیں کہ انہوں نے ایک اہم پہلو کی طرف ہماری توجُّہ مبذول فرمائی ۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء ۔ یہ مکتوبِ گرامی اور پھر اس ضمن میں ہماری طرف سے جوابی وضاحت ذیل میں پیش خدمت ہے (ص ۔ ی)

حضرت پیر صاحب کا مکتوبِ گرامی

حضرت الفاضل محترم المقام مولانا الحافظ صلاح الدین یوسف صاحب حفظہ اللہ ۔

السّلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ ، امابعد !

آں محترم کا مقالہ "عورت کی سربراہی" اخبار اہلحدیث میں شائع ہو رہا ہے ۔ مضمون الحمد للہ بہترین ہے ۔ اور دلائل مضبوط و مستحکم ہیں ۔ مخالفوں کے جوابات بھی مُسکت ہیں ۔ مجھے بہت پسند آیا ہے ۔ لیکن ایک بات رہ گئی ہے ۔ کسی صاحب نے "جنگ اخبار" میں ہی ایک بات لکھی تھی شاید وہ آں محترم کی نظر سے نہیں گزری ۔ وہ یہ ہے کسی صاحب نے اس صحیح حدیث کے متعلق یہ لکھا کہ یہ موضوع ہے اس لئے کہ اس حدیث کے راوی حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ ہیں ، جو طائف کے محاصرہ کے دوران

مشرف باسلام ہوئے تھے اور ایران کی ملکہ اس سے کافی عرصہ پہلے تخت شاہی پر بیٹھی تھی ۔ یعنی یہ حدیث تو کسی ایسے صحابی سے مروی ہونی چاہیئے تھی جو اس وقت سے پہلے مسلمان ہو چکا ہوتا ، جب ملکہ حکمران بنی ۔ اور پھر جب ان کی تخت نشینی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوتی تو آپ یہ فرماتے ۔ لیکن راوی کافی عرصہ بعد مسلمان ہوا ۔ لہٰذا انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہی نہیں ۔ اس سوال کی سطحیت تو ظاہر ہے لیکن عوام کے دلوں میں ایسی چیزیں بھی کھٹکتی ہیں ۔ اس لئے گزارش ہے کہ حدیث کے متعلق اس پہلو پر بھی ضرور آیندہ قسطوں میں تحریر فرمائیں ۔

۸۹۔۲۔۲۱ والسلام احقر العباد محب اللہ شاہ عفا اللہ عنہ

مغالطۂ مذکورہ کی وضاحت

محترم پیر صاحب موصوف حفظہ اللہ نے روزنامہ "جنگ" کراچی کے جس مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے وہ راقم کی نظر سے نہیں گزرا تاہم اس میں جو دعوےٰ کیا گیا ہے کہ ایران کی ملکہ کی تخت نشینی کا واقعہ حضرت ابوبکرۃؓ کے مشرف بہ اسلام ہونے سے کافی عرصہ قبل کا ہے ، صحیح نہیں ، کیونکہ :

۱ : محاصرۂ طائف ، جس میں حضرت ابوبکرۃؓ مسلمان ہوئے ۔ ۸ ہجری کا واقعہ ہے اور ملکۂ فارس کا واقعہ بھی ۸ ہجری کا ہی ہے کسریٰ (شاہ فارس) کا اپنے بیٹے (شیرویہ) کے ہاتھوں قتل ہونے کا واقعہ بقول واقدی ۱۰ جمادی الآخرۃ ۷ ھ میں پیش آیا ہے (ملاحظہ ہو البدایۃ والنہایۃ ۔ ج ۳ ص ۲۷۰) اس کے بعد اس کا قاتل بیٹا (شیرویہ) تخت فارس پر متمکن ہوا ۔ اس کا اقتدار چھ مہینے رہا ، پھر بیمار ہو کر مرگیا ۔ اس کے بعد پوران دخت بنتِ کسریٰ حکمران بنی جو تاریخی اعتبار سے ۸ ہجری ہی کا واقعہ بنتا ہے ۔ پھر کچھ عرصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک اس خبر کے پہنچنے میں بھی یقیناً لگا ہو گا ۔ بنابریں حضرت ابوبکرۃؓ کا اس حدیث کے سماع میں کوئی ایسا اشکال نہیں رہتا کہ جس کی بنیاد پر اس حدیث کو ردّ کیا جاسکے ۔

۲ ۔ دوسرے ، مسند احمد کی روایت میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں کہ جب عورت کے حکمران بننے کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچائی گئی تو اس وقت آپ حضرت

عائشہؓ کے پاس تھے اور آپ نے عورت کی اطاعت کو مردوں کی ہلاکت کا باعث بتلایا (ملاحظہ ہو ، الفتح الربانی ۔ ج ۲۳ ۔ ص ۳۵) جس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت کی حکمرانی کی بابت جو وعید آپؐ نے بیان فرمائی وہ حضرت عائشہؓ کی موجودگی میں فرمائی تھی ۔ پھر جب جنگ جمل کے موقع پر حضرت ابوبکرہؓ نے اس حدیث کے حوالے سے حضرت عائشہؓ سے عدم تعاون کا فیصلہ کیا تو حضرت عائشہؓ نے اس حدیث پر کوئی نکیر نہیں کی ۔ علاوہ ازیں اور بھی کسی صحابی نے اس کا انکار نہیں کیا ۔ یوں گویا حضرت عائشہؓ سمیت اصحابِ رسولؐ نے اس حدیث کی صحّت میں کوئی شک نہیں کیا بلکہ سب نے اسے تسلیم کیا ۔ اس لئے اس روایت کو اس بنا پر ردّ کر دینا کہ حضرت ابوبکرہؓ کے سوا اسے کوئی اور روایت کرنے والا نہیں ہے ،' سراسر غیر معقول رویّہ ہے کیونکہ جنگِ جَمَل میں اس روایت کی بازگشت نے اس روایت کو متعارف کروا دیا تھا ۔ اور اس پر کسی بھی طرف سے نکیر نہ ہونے کی وجہ سے اس پر گویا صحابہؓ کا اتفاق ہو گیا ہے ۔

۳ ۔ تیسرے ، مجمع الزوائد میں طبرانی کے حوالے سے حضرت ابوبکرہؓ کے علاوہ حضرت جابر بن سمرہ سے بھی بایں الفاظ ایک روایت مروی ہے ۔

لن یفلح قوم یملک رَأْیَھُمْ امرأۃ (مجمع الزوائد ، ج ۵،ص۲۰۹)

اس کے بارے میں حافظ ھَیْثمی نے یہ کہا ہے کہ اس میں ایک راوی طبرانی کے شیخ ابوعبیدۃ عبد الوارث بن ابراہیم ہیں جنہیں میں نہیں جانتا ۔ تاہم ان کے علاوہ ۔۔۔۔ اس کے بقیہ رجال ثقات ہیں ۔ لیکن طبرانی کے غیر معروف مشائخ کے بارے میں حافظ ھَیْثمی کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ثقہ ہیں (ملاحظہ ہو مقدمہ مجمع الزوائد ، ج۱۔ص۸) اس لحاظ سے یہ روایت سنداً صحیح قرار پاتی ہے ۔ تاہم اگر ضُعف تسلیم کر لیا جائے تب بھی بطور شاہد اور تائید کے طبرانی کی مذکورہ روایت قابل قبول ہو گی ۔

۴ :۔ حضرت ابوبکرہؓ کی روایت مسند احمد ، ترمذی ، نسائی وغیرہ کے علاوہ صحیح بخاری میں دو جگہ آئی ہے ۔ اس لیے اہل سنّت کے نزدیک صحیح بخاری کی یہ روایت شک و شبہ سے بالا ہے تاہم مذکورہ وجوہ کے بعد تو اس کی صحت میں اب اُن حضرات کے لئے بھی شک کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی ہے جو اس حدیث صحیح کو رد کرنے کے لئے دور دور کی کوڑی لا رہے ہیں ۔

حدیث اُمِّ ورقہؓ کی اسنادی تحقیق

حضرت پیر محب اللہ شاہ راشدی حفظہ اللہ ۔ سندھ

بہ سلسلہ "عورت کی سربراہی"

ایک مکتوب ، ایک تعاقُب اور ایک علمی مقالہ

۶ ، ۱۳ جنوری کی اشاعتِ خصوصی میں راقم کے مضمون میں حضرت اُمِّ ورقہؓ بنت نوفل کے واقعے کے بارے میں عرض کیا گیا تھا کہ ایک تو یہ سند کے لحاظ سے مضطرب ہے ، دوسرے اس میں وہ الفاظ بھی نہیں ہیں جو بنائے استدلال ہیں ۔

راقم کے مضمون کی یہ قسط حضرت پیر محب اللہ شاہ صاحب حفظہ اللہ نے پڑھ کر اس پر فاضلانہ تعاقب فرمایا ہے ۔ حضرت پیر صاحب کے تعاقب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایت ہی سنداً سخت ضعیف ہے ، اس لئے اس کی توجیہ وغیرہ کے چکر میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں ہے ۔

اگرچہ راقم نے بھی اس کے اضطراب کا ذکر کرکے اس کے ضُعف کی طرف اشارہ کر دیا تھا ، تاہم اس ضُعف کو مدلل اور نمایاں کرنے کی بجائے اس کی توجیہہ کی طرف توجہ زیادہ رکھی تھی ۔ حضرت پیر صاحب نے اس کے برعکس روایت کے ضُعف کو مدلل اور توجیہہ کو ناقابل التفات بلکہ ناقابل قبول قرار دیا ہے ۔

ہم حضرت پیر صاحب کے اس فاضلانہ تعاقُب اور محققانہ تفصیل پر بہت ممنون ہیں اور آئندہ بھی امید رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں اپنے بزرگانہ مشوروں اور علمی نوازشوں سے اسی طرح نوازتے رہیں گے ۔ اب ذیل میں قارئین کرام حضرت پیر صاحب دام ظلہ کا مکتوب گرامی ملاحظہ فرمائیں جو ایک فاضلانہ تعاقب اور علمی مقالے کی حیثیت رکھتا ہے

(ص ۔ ی)

حضرت الفاضل محترم المقام مولانا الحافظ

صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ

اما بعد آنمحترم کا مقالہ «عورت کی سربراہی» جو جریدہ اہلحدیث میں شایع ہو رہا ہے وہ میں غور و تدبر سے پڑھتا رہا ہوں ۔ مقالہ مجھے بہت پسند آیا ہے ۔ اور اسکی تین قسطوں میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس سے میں آنجناب سے متفق ہوں ۔ لیکن چوتھی قسط میں حضرت ام ورقہؓ کی دو حدیثوں کے متعلق جو کچھ تحریر فرمایا گیا ہے اسکے بارہ میں ذیل میں چند گزارشات پیش کرنا چاہتا ہوں ۔

[۱ جو احادیث حلال و حرام اور اوامر و نواھی یا احکام سے تعلق رکھتی ہوں انکے بارہ میں محدثینؒ تشدد سے کام لیتے ہیں جہاں فضائلِ اعمال یا ترغیب و ترھیب کی قسم کی احادیث ہوتی ہیں وہاں البتہ کسی حد تک تساہل برتا جاتا ہے شرط یہ ہے کہ وہ روایت موضوع یا شدید ضعف کی حامل نہ ہو ۔

[اب اس اصول کو مدنظر رکھتے ہوئے اگر ہم اُمِّ ورقہؓ کی ان دو حدیثوں پر نظر ڈالیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کی سندیں ضعیف ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان حدیثوں سے احکام اخذ کئے جاتے ہیں اسی وجہ سے محدثین نے ان پر ابواب باندھے ہیں اور عنوانات قائم کئے ہین خصوصاً اس وقت جبکہ متجد دین اور اپنے ناجائز مقاصد کے لئے کتاب و سنت سے دلائل حاصل کرنے والے ان سے اپنے غلط موقف پر دلیل پکڑ رہے ہیں تو اس صورت میں ان حدیثوں کی اسانید سے اغماض کرتے ہوئے صرف متن کی توجیہ کے لئے سعی کرنا کسی طرح بھی مستحسن بلکہ جائز قرار نہیں دیا جاسکتا ۔

[ڈاکٹر حمید اللہ صاحب ہمارے محترم ہیں اور وہ اچھے عالم بھی ہیں مگر یہ محترم حدیث کی اسانید سے کچھ زیادہ سروکار نہیں رکھتے ۔ اور کسی حدیث کے متن کی صحت کی طرف انکا رجحان ہوتا ہے تو وہ اسانید سے قطع نظر کرکے کسی نہ کسی طرح صحیح بنانے کی کوشش کرتے ہیں مثلاً مشہور موضوع روایت «اطلبوا العلم ولو بِالصِّین» کی تصحیح کے لئے انہوں نے جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ ان کی علمی شان سے براحل بعید ہے ۔ انکا یہ مضمون رسالہ محدث میں شائع ہو چکا ہے ۔ اور غالباً آنجناب کی نظر سے بھی گزرا ہوگا ۔ لہذا اس حدیث کی تصحیح جو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی طرف سے ہوئی ہے وہ کچھ مفید نہیں

ہو سکتی ۔ اسی طرح علامہ ناصر الدین البانی حفظہ اللہ جو اس عصر کے بہت بڑے محقق ہیں اور اللہ تعالی نے حدیث کے علم سے ان کو حظ وافر مرحمت فرمایا ہے لیکن بموجب «لکل جواد کبوۃ ولکل صارم نبوۃ» ان سے بھی یہاں تسامح ہو گیا ہے اور اس حدیث کو انہوں نے صحیح ابن خزیمہ کے حاشیے میں حسن قرار دیا ہے لیکن جیسا کہ ہم آیندہ انشاء اللہ اسکی وضاحت کرینگے کہ اسکی سند کسی طرح بھی حسن نہیں ہو سکتی لہذا آنجناب کے لئے لازم تھا کہ ان حدیثوں کی اسانید سے بحث اچھی طرح کرتے اور اسکی اسنادی حیثیت دلائل سے واضح فرما دیتے کہ ان کی سندیں جو ہیں وہ سخت ضعیف ہیں اس لئے انکے متون کی طرف جانے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی ۔

[ان دو حدیثوں کے متعلق جن کتب حدیث سے حوالے دئے گئے ہیں ان سب کی سندوں میں یا تو لیلیٰ بنت مالک کا ذکر ہے یا عبدالرحمن بن خلاد انصاری اور کہیں دونوں ہی سند میں موجود ہیں جیسا کہ صحیح ابن خزیمہ میں لیلی سے تو ولید بن جمیع روایت کرتا ہے ۔ اور یہ لیلیٰ عبد الرحمن بن خلاد سے روایت کرتی ہے اور مُستدرک حاکم میں ولید ان دونوں یعنی لیلی اور عبد الرحمن سے روایت کرتا ہے ان راویوں کا یہ حال ہے ۔ لیلی کے متعلق حافظ ابن حجر تھذیب التھذیب و تقریب التھذیب میں فرماتے ہیں «لاتعرف» اور ان سے راوی بھی صرف ولید بن عبداللہ بن جمیع ہے لہذا یہ مجھولہ ہوئی اور جھالت بھی جروح شدیدہ میں سے ہے جیسا کہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں ۔ اور دوسرے راوی عبدالرحمن بن خلاد ہیں ۔ اسکے متعلق بھی حافظ صاحب دونوں کتابوں میں فرماتے ہیں «مجھول الحال» لھذا ایسی حدیث جس کی سند میں ایسے غیر معروف راوی ہوں وہ کیسے حسن یا صحیح ہو سکتی ہے ۔

[دوسرے اس حدیث کی سند میں شدید اضطراب ہے ۔ مسند احمد میں ولید کہتے ہیں کہ حدّثتنی جدّتی عن ام ورقۃ اور ولید کی دادی وہی لیلی بنت مالک ہے ۔ اور یہاں لیلی براہ راست ام ورقہ سے روایت کرتی ہے درآنحالیکہ صحیح ابن خزیمہ میں لیلی اور ام ورقہ کے درمیان «عن ابیھا وعن عبدالرحمن بن خلاد» کا واسطہ ہے اور پھر صحیح ابن خزیمہ میں عبدالرحمن بن خلاد سے لیلی روایت کرتی ہے اور اس کے بجائے مستدرک حاکم میں عبدالرحمن بن خلاد سے ولید بن جمیع روایت کرتے ہیں اسکے علاوہ اسمیں اضطراب کی

اور بھی وجوہ ہیں جو تھذیب التھذیب میں دیکھی جاسکتی ہیں [1]

[ایسی مضطرب الاسناد حدیث کسی طرح بھی حجت نہیں ہو سکتی کیونکہ جیسا کہ اصول حدیث میں بیان کیا جاچکا ہے کہ ایسا اضطراب جس میں نہ کوئی تطبیق ہو سکتی ہو اور نہ کسی معقول دلیل سے انکے وجوہ میں سے کسی ایک کو ترجیح ہی دی جاسکتی ہو ، وہ موجب ضعف ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس جگہ ان وجوہ اضطراب میں سے نہ کسی کو ترجیح دی جاسکتی ہے اور نہ ان میں باہم تطبیق کی کوئی صورت ہی نکل سکتی ہے پس یہ حدیث دو وجہ سے ضعیف و ناقابل حجت ہے ۔ ایک رُواۃ کے ضعف کی وجہ سے اور دوسرے شدید اضطراب کی وجہ سے ۔

[ایسی ضعیف و ناکارہ حدیث کے بارہ میں کون سی ضرورت پڑی ہے کہ انکے متن کی توجیہ کے لئے درد سر مول لیں ، علاوہ ازیں یہ حدیثیں صحیحین کی بھی نہیں ہیں بلکہ ان کتب کی ہیں جن میں صحاح کے ساتھ حسان ، ضعاف منکرات اور شواھد وغیرہ موجود ہیں لہذا بموجب ثبت العرش ثم انقش مستدلین حضرات پہلے تو ان حدیثوں کی صحت یا حسن کا دلائل سے اثبات کریں پھر ان سے دلیل پکڑنے کی سعی کریں ۔

کچھ حدیث مذکور کی توجیہہ کے بارے میں

ان حدیثوں کے متعلق جو توجیہ کی گئی ہے اس کی بابت بھی کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہا جاتا ہے کہ یہ استثنائی صورت ہے اگر ہم اس کو مان لیں تو مخالفین یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں عورت کی سربراہی بھی ایک استثنائی صورت ہے یعنی جب ایسی استثنائی صورتوں میں عورت نماز کی امامت مردوں کے لئے خواہ وہ شیخ کبیر ہوں کر سکتی ہے تو ملک کی سربراہی کسی خاص صورت میں کیوں نہیں کر سکتی ؟ کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امامت کبریٰ کے بارے میں من جملہ اور امور کے اس حقیقت سے بھی استدلال کیا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات سے قبل حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ہی نماز کی امامت سپرد فرمائی تھی اس لئے

---

[1] «الاصابہ» میں حضرت اُمّ ورقہؓ کے ترجمہ سے بھی اس اضطراب کی تائید ہوتی ہے ، جیسا کہ حضرت پیر صاحب دامت برکاتھم نے فرمایا ہے ۔ (ص ۔ ی)

ان کی خلافت کے متعلق یہ کہا گیا کہ جس ہستی کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے دینی معاملات یعنی نماز کا پیش امام بنایا وہی ہمارے دنیوی امور میں بھی امام ہوگا۔ دوسرے کوئی بھی ان سے آگے نہیں ہوسکتا لہذا مردوں کی امامت اگر عورت نماز میں کسی خاص حالت میں کراسکتی ہے تو پھر ملک کے امور میں بھی کسی استثنائی حالت میں وہ سربراہ بھی بن سکتی ہے۔ باقی محترم ڈاکٹر صاحب نے ایک عورت کو یہ اجازت دی تو وہ اپنے شوہر کی نماز میں امامت کرالے تو یہ چیز بھی ہم جیسے ہیچ مدانوں کی سمجھ سے بالاتر ہے کیا وہ مسلم عورت اپنے شوہر کو زبانی طور تعلیم نہیں دے سکتی تھی؟ اور کیا یہ صورت ممکن نہیں تھی کہ وہ اپنے شوہر کو ایک جانب بٹھا کر خود نماز پڑھاتی اور شوہر ان کے انتقالات وغیرھا کو غور سے ملاحظہ کرتا رہتا اس طرح نماز کی ہیئت کذائیہ ان کے ذہن نشین ہو جاتی۔ آخر نماز کے لئے تین چار سورتیں اپنے شوہر کو یاد کرانے کے لئے بھی تو ان کو اپنی زبان سے کام لینا پڑتا پھر بقیہ باتوں میں وہ کیوں نہیں اپنی زبان سے کام لے سکتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے ان صاحب کے معاشقہ کا قصہ بھی لکھا ہے اسی معاشقہ کا ہی نتیجہ ہوا کہ اس نے اپنا مذہب چھوڑ کر دین اسلام قبول کر لیا لہذا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان کے معاشقہ کا ہی کرشمہ ہے کہ وہ شوہر بن کر بھی یعنی عورت پر قوام ہونے کے باوجود اپنے آپکو محکوم ہی تصور کر رہا ہے اور اس وجہ سے اپنی محبوبہ بیوی کو امام ہی بنا لیا۔ یہ قلب حقیقت کی ایک انوکھی مثال ہے اور مجھے تعجب ہے کہ آں محترم جیسے محقق نے ڈاکٹر صاحب کی اس توجیہ کی کیسے تحسین فرمائی؟

[خلاصہ کلام یہ ہے کہ یہ حدیث اولاً تو سخت ضعیف ہے اس سے استدلال کرنا قطعی نامناسب ہے اور اگر ہم اس سے تسامح برتیں تب بھی اسکا مطلب واضح طور پر وہ ہی ہے جو محدثین کرام رحمھم اللہ نے ان حدیثوں پر عنوانات قائم کرکے بیان فرمایا ہے۔ یعنی عورت کا عورتوں کو امامت کرانے کا جواز۔ باقی اس میں مردوں کی امامت کی نہ صراحت ہے اور نہ کوئی اشارہ ہی ہے اور دوسیری جو بھی توجیہ کسی نے کی ہے (کائناً مَّنْ کَانَ) وہ حتماً و جزماً غلط ہے انکی تحسین یا تصحیح نہیں کی جاسکتی ہے کیونکہ یہ اسلام کے صریح احکام اور واضح ارشادات کے سراسر مخالف ہے۔ ان کو کسی طرح بھی قبول نہیں کیا جاسکتا ان چیزوں میں تھوڑا سا تساہُل بھی ان چور دروازوں کے طلاب کے لئے ایک موقعہ فراہم کرنے کے مترادف ہوگا۔ العاقل تکفیہ الاشارۃ۔ واللہ اعلم بالصواب

والسلام احقر العباد محب اللہ شاہ عفا اللہ عنہ
۱۹ رجب المرجب ۱۴۰۹ھ

حکمرانی کی شرائط میں ایک شرط حکمران کا مرد ہونا ہے

نواب صدیق حسن خانؒ کی صراحت

٦ ـ ١٣ جنوری "الاعتصام" کی اس مشترکہ اشاعتِ خصوصی میں جو "عورت کی سربراہی" کے مسئلے میں شکوک و شبہات اور مغالطات کے ازالے پر مشتمل تھی ایک حصہ پروفیسر اسلم صاحب کے جواب میں بھی تھا ـ جس میں ان کے نواب صدیق حسن خان کے فتویٰ کے مطالبے کے سلسلے میں ان کی عربی اور اُردو تفاسیر کا حوالہ دیا گیا تھا کہ پروفیسر موصوف یہ تفسیری حصّے ملاحظہ فرمالیں ، جہاں نواب صاحب نے مرد کی حاکمیت کو تسلیم کرتے ہوئے حدیث لن یفلح قوم ..... کا بھی حوالہ دیا ہے ـ
لیکن اس مضمون کی اشاعت کے بعد پروفیسر محمد اسلم صاحب نے راقم کے نام ایک ذاتی مکتوب لکھا ہے جس میں انہوں نے علمائے اہلحدیث کے خلاف سخت بغض و عناد کا اظہار کرکے اپنے جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں ـ اگر ضرورت پیش آئی تو پھر کسی وقت ان کا مکتوب شائع کر دیا جائے گا ، فی الحال ان کو اسی طرح نجی انداز میں جواب بھیج دیا گیا ہے ، جس طرح ان کا خط آیا تھا ـ ہاں تو اس خط میں انہوں نے مذکورہ وضاحت کے باوجود پھر اپنے اس مطالبے کا اعادہ کیا ہے کہ :ـ
"نواب صدیق حسن خان قنوجی کا فتوےٰ فراہم کرنا اہلحدیث کے ذمّے ہے ، اہلحدیث یہ بتائیں کہ نواب صاحب نے عورت کی حکمرانی کو کہاں حرام کہا ہے ؟"
اس مطالبے سے موصوف کا مطلب اگر یہ ہے کہ لفظ "حرام" کی نشاندہی کی جائے تو شاید ہم یہ لفظ اسی طرح دکھانے سے معذور ہوں جس طرح شراب کو حلال باور کرانے والے "جدید مجتہدین" کے مطالبہ کہ قرآن میں شراب کو "حرام" کہاں کہا گیا ہے ؟ علماء لفظ "حرام" دکھانے سے معذور ہیں ـ تاہم اگر موصوف کا مطلب عورت کی سربراہی کی

شرعی حیثیت کی وضاحت ہے تو اس کے لئے ہم پہلے ہی ان کی عربی اور اُردو دونوں تفاسیر کا حوالہ پیش کر چکے ہیں ۔ تاہم مزید اتمام حجت کے لئے ان کی تفاسیر کی اصل عبارتیں اور ان کی ایک اور کتاب سے اس کی صراحت ذیل میں پیش کر رہے ہیں ۔ واللہ یھدی من یّشاء الی صراط مستقیم (ص ۔ ی)

نواب صاحبؒ کی ایک عربی کتاب کا اقتباس اور اس کا ترجمہ:

ومنها كونه ذَكراً ووجهه ان النساء ناقصات عقل ودين كما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم ومن كان كذالك لايصلح لتدبير الامة ولتولى الحكم بين عباد الله و فصل خصوماتهم بماتقتضيه الشريعة المطهرة ويوجبه العدل ، فليس بعد نقصان العقل والدين شئٌ . ولا تقاس الامامة والقضاء على الرواية فانها تروى مابلغها وتحكى ما قيل لها واما الامـامة والقضاء فهو يحتاج الى اجتهاد الرأى وكمال الادراك والتبصر فى الامور والتفهُّم لحقائقها ، وليست المرأة فى ورد و لاصدر من ذلك ولاتقوى على تدبير امر العباد والبلاد بل هى اضعف من ذلك و اعجز ، ويؤيد هذا ماثبت فى الصحيح للبخارى من حديث ابى بكرة رضى الله عنه من قوله صلى الله عليه وسلم لن يفلح قوم ولّوا امرهم امرأة قاله لمابلغ ان اهل فارس قد ملكوا عليهم بنت كسرىٰ يعنى بوران بنت شيرويه بن كسرى فليس بعد نفى الفلاح شئٌ من الوعيد الشديدو رأس الامور هوالا مامة والقضاء بحكم الله عزوجل فدخوله فيها يكون دخولاً اولياً . (اكليل الكرامة فى تبيان مقاصد الامامة . ص ٦٦ . ٦٧)

”حکمران کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مرد ہو کیوں کہ عورتیں عقل اور دین میں ناقص ہیں ۔ جیساکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ، اور جو عقل و دین میں ناقص ہو وہ تدبیر امت ، فصلِ خصومات اور اللہ کے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنے کی اس طرح اہلیت سے بہرہ ور نہیں ہوسکتا جو شریعت الہیہ کا اقتضاء اور عدل و انصاف کے لحاظ سے ضروری ہے پس عقل و دین میں نقصان کے بعد کچھ نہیں ۔

علاوہ ازیں امامت (حکمرانی) اور قضاء کو روایت (حدیث رسولؐ بیان کرنے) پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ۔ اس لئے کہ روایت میں تو عورت وہی کچھ بیان کرتی ہے جو اسے پہنچتا اور وہی کچھ نقل کرتی ہے جو اس سے کہا گیا ہوتا ہے ۔ لیکن حکمرانی اور قضاء کا مسئلہ اس سے بالکل مختلف ہے ، اس کے لئے تو اجتہادِ رائے ، کمالِ ادراک ، معاملات

میں گہری بصیرت اور حقائق تک پہنچنے کے لئے قوتِ فہم نہایت ضروری ہیں ، جب کہ عورت ان خوبیوں سے متصف ہے نہ وہ بندوں اور شہروں کے معاملات کی تدبیر کی قوت رکھتی ہے بلکہ وہ ان اُمور میں نہایت کمزور اور حد درجہ عاجز ہے ۔ اس کی تائید صحیح بخاری کی اس حدیثِ ابی بکرۃؓ سے بھی ہوتی ہے ۔ جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "وہ قوم ہرگز فلاح یاب نہیں ہوگی جس نے اپنے معاملات ایک عورت کے سپرد کر دیئے"۔ یہ بات آپؐ نے اُس وقت ارشاد فرمائی تھی جب آپؐ کو یہ خبر پہنچی کہ اہل فارس نے اپنا حکمران بنتِ کسریٰ یعنی بوران بنت شیرویہ بن کسریٰ کو بنا لیا ہے ۔ پس آپؐ کا ایسی قوم سے فلاح کی نفی کر دینا بہت شدید وعید ہے اور معاملات کی اصل بنیاد اللہ کے حکم کے مطابق امامت و قضاء ہی ہے پس یہ معاملہ اس میں سب سے پہلے داخل ہوگا"۔

اُردو تفسیر "ترجمان القرآن" میں وضاحت

نواب صاحب اپنی اُردو تفسیر "ترجمان القرآن" میں آیت وللرجال علیھن درجۃ (البقرۃ ۲۲۸) کی تفسیر میں فرماتے ہیں :۔

"مردوں کو عورتوں پر درجہ حاصل ہے یعنی خلق و خلق میں فضیلت رکھتے ہیں ۔ منزلت و طاعت ۔ امرو انفاق و قیام مصالح میں بڑھے ہوئے ہیں ۔ یہ اہل جہاد و عقل و قوت ہیں ۔ ان کا حصہ میراث میں دوگنا ہے ۔ ان کی اطاعت عورت پر واجب ہے عورت موافق ان کی رضا مندی کے رہے سہے ۔ گواہی ، ولایت ، صلاحیت ، امامت و قضا میں بھی مقدم ہیں ۔ یہ ایک عورت پر دوسری ، تیسری ، چوتھی جورو اور بے گنتی لونڈیاں لاسکتے ہیں ۔ عورت دوسرا شوہر ان کی موجودگی میں نہیں کر سکتی ۔ طلاق ورجعت بھی انہیں کے ہاتھ میں ہے نہ عورت کے ۔ اگر اور کچھ فضیلت مرد کو عورت پر نہ ہوتی تو یہ کیا کم بزرگی ہے کہ عورت مرد سے پیدا ہوئی ہے کیونکہ پیدا ہونا حوا کا آدم کی بائیں پسلی سے ثابت ہو چکا ہے ۔ فرمایا کہ اگر میں کسی کو کہتا کہ کسی کو سجدہ کرو تو عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کیا کرے اس کو بغوی نے اپنی سند سے روایت کیا ہے یہ بات حدیث معاذ بن جبل میں آئی ہے ۔ یہ فضیلت مرد کی عورت پر

دنیا و آخرت دونوں جگہ میں ثابت ہے ۔ کما قال اللہ تعالی "الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضہم علی بعض وبما انفقوا من اموالہم اطلاق فضیلت مفید عموم ہے"۔

(ترجمان القرآن : ج۱،ص۲۹۹)

اور آیت الرجال قوامون علی النساء۔ آلایۃ کے تحت فرماتے ہیں ۔

"یعنی اللہ نے مرد کا درجہ اُوپر بنایا تو عورت کو اس کی حکم برداری چاہئیے اور اگر ایک عورت بدخوئی کرے تو مرد پہلے درجے سمجھائے دوسرے درجے جدا سووے لیکن اسی گھر میں ، پھر آخر درجے مارے بھی ، لیکن نہ ایسا کہ ضرب پہنچے پھر اگر مطیع ہو جاوے توکرید نہ کرے تقصیروں پر اللہ سب پر حاکم ہے ۔ باقی ہر تقصیر کی ایک حد ہے ، مارنا آخر کا درجہ ہے ۔

ف :۔ اللہ نے اس آیت میں یہ ارشاد کیا کہ مرد عورت پر قیم ہے یعنی اس کا رئیس کبیر حاکم مؤدِّب ہے جب عورت کجروی کرے ، یہ اس کو ادب دے ، اس لئے کہ مرد افضل ہیں عورتوں سے ، اسی لئے نبوّت مختص ہے ساتھ رجال کے ، بادشاہئ اعظم خاص ہے ساتھ مردوں کے لقولہ صلی اللہ علیہ وسلم لن یفلح قوم وَلّوا امرھم امرأۃ رواہ البخاری من حدیث ابی بکرۃ رضی اللہ عنہ ، اسی طرح منصبِ قضا وغیرہ مخصوص ہے ساتھ مردوں کے ۔ علاوہ اس کے مرد اپنا مال عورت پر صرف کرتے ہیں جیسے مہور و نفقات وغیرہ ۔ حقوق جو کتاب و سنّت میں آئے ہیں اس لئے مرد فی نفسہ عورت سے افضل ہے ۔ فضل و افضال میں اس پر مقدم ہے اسی سبب سے قیم ہونا مرد کا مناسب ٹھہرا ۔ کما قال اللہ تعالیٰ وَلِلرِّجال علیہن درجۃ ۔ ابن عباسؓ نے کہا مراد قوامون سے امراء ہیں ۔ یعنی عورت کو لازم ہے کہ جس امر میں اللہ نے اطاعتِ مرد کا حکم اسے دیا ہے اس امر میں اس کی مطیع رہے اطاعت یہ ہے کہ گھر والوں سے نیکی کرے ۔ شوہر کی نگہبان ہو یہی قول ہے مقاتل ۔ سدی و ضحاک کا (تفسیر ترجمان القرآن،ج۲،ص ۲ ۶۴)

آگے چل کر مزید فرماتے ہیں ۔

"فتح البیان کا بیان ہے کہ مرد مسلط ہیں عورتوں پر یعنی جس طرح حکام و امراء حفاظتِ رعیت کرتے ہیں اسی طرح مرد عورت کا نگہبان ہوتا ہے ۔ پھر علاوہ اسکے گھر بار روٹی کپڑا دیتا ہے قوام صیغہ ہے مبالغے کا اس میں بیّن دلیل ہے اس بات پر کہ مرد اصل میں اس کام میں قائم ہیں ساتھ مصالح و تدبیرات خانگی و تادیب کے جس طرح کہ

بادشاہ رعیت کے کاموں پر قائم و دائم ہوتے ہیں ۔ یہ فضیلت مردوں کو اللہ تعالی کی طرف سے ملی ہے ۔ انبیاء و خلفاء وسلاطین و حکام وائمہ وغُزاۃ سب مرد ہی ہوتے ہیں عقل و دین و شہادت و جمعہ و جماعت میں عورت سے بڑھ کر ہیں مرد چار جورو کر سکتا ہے ۔ عورت ایک شوہر سے زیادہ نہیں کر سکتی ، مرد کا حصہ میراث میں زیادہ ہے ، طلاق و رجعت ہاتھ میں مرد کے ہے نسب باپ کا ہوتا ہے نہ ماں کا ۔ ان کے سوا اور بہت امور ہیں جن میں مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے" (تفسیر "ترجمان القرآن" ج ۲ ، ص ۶۴۴)

عربی تفسیر "فتح البیان" میں صراحت

عربی تفسیر میں مسئلہ زیر بحث میں ان کی صراحت حسب ذیل ہے ۔

وللرجال عليهن درجة . ایْ منزلة ليست لهن وهیٰ قيامه عليها فی الانفاق وكونه من اهل الجهاد والعقل والقوة وله من الميراث اكثر مما لها و كونه يجب عليها امتثال امره والوقوف عندرضائه والشهادة والدية وصلاحية الامامة والقضاء وله ان يتزوج عليها و يتسرى وليس لها ذلك وبيده الطلاق والرجعة وليس شیءٌ من ذلك بيدها ولولم يكن من فضيلة الرجال على النساء الاكونهن خلقن من الرجال لماثبت ان حواء خلقت من ضلع ادم لكفى وقد اخرج اهل السنن عن عمر و بن الاحوص ان رسول الله صلى الله عليه وسلم قال الا ان لكم على نساء كم حقا ولنساء كم عليكم حقا اماحقكم على نسائكم ان لايوطين فرشكم من تكرهون ولايأذن فی بيوتكم لمن تكرهون الا وحَقُّهن عليكم ان تحسنوا اليهم فی كسوتهن و طعامهن وصححه الترمذی واصله عند مسلم فی الصحيح واخرج احمد وابوداؤد والنسائی وابن ماجه وابن جرير والحاكم وصححه والبيهقی عن معاوية بن حيده القشيری انه سأل النبی صلى الله عليه وسلم ماحق المرأة على الزوج قال ان تطعمها اذا طعمت وتكسوها اذا اكتسيت ولا تضرب الوجه ولاتهجرالا فی البيت «والله عزيز حكيم» فيما دبره لخلقه عن ابن ابی ظبيان ان معاذ بن جبل خرج فی غزاةٍ بعثه رسول الله صلى الله عليه وسلم فيها ثم رجع فرأى رجالاً يسجد بعضهم لبعض فذكر ذلك لرسول الله صلى الله عليه وسلم فقال لوامرت احداً ان يسجد لاحدلامرت المرأة ان تسجد لزوجها رواه البغوی بسنده (فتح البيان ، ج۱ . ص۲۶۹)

اور آیت الرجال قوامون علی النساء الآیۃ کے تحت فرماتے ہیں ۔

الرجال قوامون مسلطون علی النساء کلام مستانف سیق لبیان سبب استحقاق الرجال الزیادۃ فی المیراث تفضیلا اثر بیان تفاوت استحقاقھم اجمالاً و علل ذلک بامرین اولھما وھبی والثانی کسبی والمعنی انھم یقومون بالذب عنھن کما یقوم الحکام والامراء بالذب عن الرعیۃ وھم ایضا یقومون بمایحتجن الیہ من النفقۃ والکسوۃ والمسکن وجاء بصیغۃ المبالغۃ لتدل علی اصالتھم فی ھذا الامر وھو جمع قوام وھو القائم بالمصالح والتدبیر والتادیب یشیر بہ الی ان المراد قیام الولاۃ علی الرعایا قال ابن عباس امروا علیھن فعلی المرأۃ ان تطیع زوجھا فی طاعۃ اللہ بما الباء سببیۃ وما مصدریۃ فضّل اللہ والضمیر فی قولہ بعضھم علی بعض للرجال والنساء ای انما استحقوا ھذہ المزیۃ لتفضیل اللہ ایاھم علیھن بما فضلھم بہ من کون فیھم الانبیاء والخلفاء والسلاطین والحکام والائمۃ والغزاۃ و زیادۃ العقل والدین والشھادۃ والجمعۃ والجماعات وان الرجل یتزوج باربع نسوۃ ولایجو زللمرأۃ غیر زوج واحدو زیادۃ النصیب والتعصیب فی المیراث وبیدہ الطلاق والنکاح والرجعۃ والیہ الانتساب وغیر ذلک من الامور فکل ھذا یدل علی فضل الرجال علی النساء (فتح البیان ، ج۱،ص۵۵۵)

عربی تفسیر کی مذکورہ دونوں عبارتوں کا وہی مفہوم ہے جو انہوں نے اُردو تفسیر میں بیان کیا ہے اور پہلے نقل کیا جاچکا ہے ۔ اس لئے ان عربی عبارات کے ترجمہ کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ۔

بہرحال نواب صدیق حسن خان کی ان واضح تصریحات کے بعد اس امر میں کوئی شک و شبہ باقی نہیں رہ جاتا ہے کہ نواب صاحب علیہ الرحمۃ کے نزدیک بھی عورت امامتِ کُبریٰ (حکمرانی) کی اہل نہیں ہے ، اس معاملے میں بھی مرد کو بعض دیگر امتیازی خوبیوں کے ساتھ عورت پر ایک گونہ فضیلت حاصل ہے ۔

عورت کی سربراہی کے بارے میں علماء کا مُتّحدہ موقف

چند غلط فہمیوں کا ازالہ

۲۷ فروری ۱۹۸۹ء کو راولپنڈی میں عورت کی سربراہی کے مسئلے پر اہل سُنّت کے تمام مکاتب فکر کے علماء کا ایک متحدہ کنونشن ہوا تھا ، جس میں مُلک بھر سے علمائے کرام بھاری تعداد میں شریک ہوئے ۔ اس کنونشن میں متفقہ طور پر جدوجہد کرنے کا عزم کیا گیا ۔

ذیل کے اداریے میں جو «الاعتصام» میں چھپا ، اسی کنونشن ، اس کی کاروائی اور اس کے فیصلوں پر ایک مختصر تبصرہ ہے جس میں بالخصوص ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے جو مخالفِ اسلام حلقوں کی طرف سے علمائے کرام کے مذکورہ متفقہ موقف اور متحدہ عزم کے بارے میں پھیلائی جا رہی ہیں (ص ۔ ی)

اہل سنّت کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء نے "عورت کی سربراہی" کے مسئلے پر جو متحدہ موقف اپنایا ہے اور اتحادِ فکر و اشتراکِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے جس طرح اس کے خلاف متحدہ جدوجہد کرنے کا عزم کیا ہے ۔ وہ نہایت خوش آئند ، ان کی ایمانی غیرت و حمیت کا آئینہ دار اور ملک و ملّت کی خیر خواہی کا عکّاس ہے ۔ تاہم اس بارے میں بعض حلقے بدگمانی کا شکار ہیں اور کچھ کو بدگمان کرنے کی مذموم سعی کی جارہی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بابت بھی کچھ عرض کر دیا جائے ۔ تاکہ لوگ کم از کم محض جھوٹے پروپیگنڈے کی وجہ سے تو کسی غلط فہمی اور بدگمانی کا شکار نہ ہوں ۔

ایک بات یہ پھیلائی جارہی ہے کہ مذکورہ کنونشن اسلامی اتّحاد بالخصوص نواز شریف کی انگیخت اور ان کی تائید و حمایت کا نتیجہ ہے ہمارے نزدیک یہ ایک بہت بڑا جھوٹ اور بہتان ہے جو علمائے کرام پر باندھا جا رہا ہے ۔ دراں حالیکہ ان کا دامن ایسی کاسہ

لیسیوں اور مصلحت فریبیوں سے پاک ہے ۔ سبحانک ہذا بہتانٌ عظیمٌ ۔

واقعہ یہ ہے کہ یہ کنونشن کسی کے کہنے پر نہیں ہوا ۔ بلکہ علماء کا احساسِ فرض اور جذبۂ احقاقِ حق ہی اس کا باعث بنا ہے ۔ اس کے پس پردہ کوئی مخصوص اغراض نہیں ، صرف مسئلے کی اصل نوعیّت اور اس کی شرعی حیثیّت کی وضاحت ہی اس کا واحد مقصد ہے اور اس کے کوئی سیاسی مقاصد بھی نہیں ۔ صرف اللہ کی رضا ہی اس ساری سعی و کاوش کا مرکز و محور ہے ۔

بعض لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ علماء کی بات اگرچہ اپنی جگہ ٹھیک ہے لیکن یہ بات کرنے کا وقت ابھی نہیں آیا ۔ اس وقت علماء کی اس جدّوجہد سے "جمہوریت" کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو ان حضرات سے یہ پُوچھا جاسکتا ہے کہ خود پیپلز پارٹی کا جو رویّہ ہے ، کیا وہ جمہوریت کے تحفّظ کا آئینہ دار ہے ؟ ہمارے خیال میں تو جمہوریت کو تباہ کرنے کے لئے خود پیپلز پارٹی جو کردار ادا کر رہی ہے ، اس کے بعد علماء یا کسی اور کو اس کے لئے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے ۔ اس سے قبل ۱۹۷۷ء میں بھی پیپلزپارٹی نے دھاندلی کا ریکارڈ قائم کرکے "جمہوریت" کو تباہ کیا تھا اور اپنے اس دورثانی میں بھی وہ جس راستے پر گامزن ہے اور اس کے جو طور طریقے ہیں ، اس کا نتیجہ بھی بظاہر وہی نکلتا نظر آتا ہے جو اس کے دور اوّل کی تاریخ کا ایک اٹوٹ انگ ہے ۔

ثانیًا علماء کی یہ جدّوجہد آئین و قانون کے دائرے میں ہے ، جس سے قطعاً کسی قسم کے انتشار کا امکان نہیں ۔ وہ عورت کی حکمرانی سے اختلاف کرکے قانون کے دائرے میں اپنا ایک مُسلّمہ جمہوری حق استعمال کر رہے ہیں ۔ انتشار تو وہ لوگ پھیلا رہے ہیں جو عُلماء کے اس حق آزادئ رائے اور اظہارِ اختلاف کی راہ میں غیر جمہوری ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں ۔ یا پھر وہ اہل قلم و اہل منبر پھیلا رہے ہیں جو عُلماء کے اس قسم کے خالص علمی اور جمہوری اجتماعات میں بھی انتشار کی "بو" محسوس کر رہے ہیں ۔ یا لوگوں کو باور کرا رہے ہیں ۔

ثالثًا علماء کی اس جدّوجہد کا مقصد محض پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف محاذ آرائی نہیں ہے کہ جس سے "جمہوریت" کو خطرہ لاحق ہو ۔ بلکہ اس کی اس پالیسی کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کرنا ہے جو اس نے اسلام کے مسلّمہ اصول و اقدار کو نظر انداز

کر کے ایک عورت کو حکومت کا سربراہ بنا دیا ہے ۔ اگرچہ مجموعی حیثیت سے پیپلز پارٹی کی تحسین بھی علمائے کرام صحیح نہیں سمجھتے کیونکہ اس کا مجموعی کردار ہمیشہ ہی نقد و جرح کا ہدف رہا ہے اور بظاہر رہے گا ، لیکن عورت کو سربراہ بنانے کا جُرم تو اتنا ہولناک اور خوفناک ہے کہ اس کے بارے میں تو مفاہمت کی ادنیٰ سی بھی گنجائش نہیں ہے ۔

رابعًا اس سے مقصود اُمّتِ مُسلمہ کو متنبہ کرنا ہے کہ وہ اس صورت حال کو جتنی جلدی تبدیل کرسکے ، اس کو اپنی طاقت کے مطابق اس کے لئے سعی کرنی چاہیئے ۔ کیونکہ یہ صورت حال نبی صلّی اللہ علیہ وسلّم کے فرمان کے مطابق سخت نقصان اور خسارے کی ہے ۔ دین کے ایک نہایت اہم مسئلے میں مداہنت یا تغافل و اعراض کی پالیسی عذابِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے ۔ علماء نہیں چاہتے کہ وہ خاموش رہ کر اس نقصان اور تباہی میں حصّہ دار بنیں ۔ کچھ اور نہیں تو ادائیگی فرض کے بعد وہ انشاء اللہ عند اللہ تو سرخ رو ہوسکیں گے ۔

خامسًا علماء کی اس متحدہ جدّوجہد سے مسئلے کی صحیح حثیت نکھر کر سامنے آگئی ہے ۔ اب اس پر نہ شکوک و شبہات اور مغالطات کے پردے ڈالے جاسکتے ہیں ، اور نہ کبھی آئندہ یہ کہا جاسکے گا کہ فلاں موقعے پر علماء نے فلاں عورت کی حکومت کو تسلیم کیا تھا ۔ علماء کے اس متحدہ اقدام نے شُبہات کے دَل بادل بھی صاف کر دیئے ہیں اور آیندہ کے لئے لوگوں کے منہ بھی بند کر دیئے ہیں ۔ جزاھم اللہ احسن الجزاء ووقاھم عن الشرور والفتن وایدھم بنصرہ العزیز واللہ غالب علیٰ امرہ انّ اللہ علی کلّ شيءٍ قدیر ۔

(اداریہ "الاعتصام" ۱۷، ۲۴ مارچ ۱۹۸۹ء)

بسلسلہ عورت کی سربراہی

ایک ہندوستانی مسلمان بھائی کا خط
اور
اس کا جواب

راقم کا مضمون "عورت کی سربراہی کا مسئلہ" جو قارئین کرام گذشتہ صفحات میں ملاحظہ فرما چکے ہیں، دہلی (ہند) کے پندرہ روزہ "ترجمان" دہلی میں بھی بالاقساط شائع ہوا، جسے پڑھ کر اس کے ایک قاری نے "ترجمان" دہلی کے دفتر ایک خط میں اپنے کچھ شبہات پیش کئے۔ "ترجمان" والوں نے وہ خط راقم کو بھیج دیا۔ ذیل میں وہ خط اور اس کا جواب پیش کیا جارہا ہے۔ افادیت کے نقطۂ نظر سے اس سوال جواب کو بھی کتاب میں شامل کیا جارہا ہے۔ (ص۔ ی)

ہندوستانی بھائی کا خط

از عبدالملک عبدالرحیم پرفیومرس،
نزد مسجد قاضیان
فتح پور شیخاواٹی (سیکر)، راجستھان ۵۲۳۰۱

الفاضل/مدیر المحترم "جریدہ ترجمان"

السلام علیکم و آداب کے بعد عرض ہے کہ آپ کے اخبار میں قسط وار چھپنے والا حافظ صلاح الدین یوسف صاحب لاہور کا مضمون ـــــ عورت کی سربراہی کا مسئلہ اور شکوک و شبہات کا ایک جائزہ ـــــ ۱۶ اگست ۱۹۸۹ء کے شمارے میں ختم ہوا۔ الحمد للہ۔

مجھے اس سے غرض نہیں کہ کس ملک میں کس حکمران کا تعلق کونسی صنف سے ہے تاہم تمام قسطیں پڑھنے کے بعد بھی کچھ سوال، جواب طلب ہیں۔

۱۔ یہ جو مشہور ہے کہ اسلام میں کسی عہدہ یا منصب کے لئے خواہش کرنا یا خود سے طلب کرنا روا

نہیں ہے تو مملکت خداداد جمہوریہ اسلامی کے انتخابات میں جو بھی مسلمان بشمول مولوی صاحبان کے امیدوار بنے اور بڑھ چڑھ کر نظام مصطفیٰ کے قیام کے لئے اپنے آپ کو واحد موزوں ترین امیدوار بتاتے رہے ـــــ تو کیوں ؟

۲۔ توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء الآیۃ

کی رو سے تخت یا تختہ خدا جس کو چاہے دے سکتا ہے اور بھٹو کی مثال سے ہمارا ایمان اللہ کے کلام پر اور پختہ ہو گیا تھا ـــــ مگر یہ مضمون پڑھنے کے بعد ذہن میں سوال ابھرا کہ

کیا (نعوذ باللہ) انہی بھٹو کی صاحب زادی کو کسی اور طاقت (؟؟؟) نے وزیر اعظم بنا دیا ہے

ـــــ

۳۔ درحقیقت علماء کرام نے عوام الناس کو جمہوریت کی راہ دکھائی تھی جس پر وہ چلے ـــــ اسلام سکھاتے، فرد کی اصلاح کرتے تو معاشرے کی بھی اصلاح ہوتی لوگ مسلمان ہوتے اور اسلامی نظام پسند کر کے "اسلامی حکمراں" کو ہی ووٹ دیتے ـــــ

ورنہ جیسے ہم اور ہمارے اعمال ہیں اسی کے مطابق ہمارے حکمران.

واللہ ولی التوفیق

والسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

مذکورہ خط کا جواب

جریدہ "ترجمان" دہلی کے ایک قاری نے مذکورہ مکتوب میں جو چند اشکالات پیش کئے ہیں، ان کا جواب مختصراً عرض ہے۔

۱۔ عہدہ و منصب کے خواہش مند اور طلب گار کو عہدہ و منصب نہ دینے کا حکم اور تاکید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد ارشادات سے ثابت ہے اور یہ حکم جن حکم و مصالح پر مبنی ہے۔ وہ بھی زیادہ محتاج وضاحت نہیں۔ اس لئے اسلام کا یہ حکم تو بجائے خود شک و شبہ سے بالا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موجودہ مسلمانوں کا کردار و عمل اس کے خلاف ہے، یا پاکستان میں اس حکم کے باوجود علمائے کرام اور مذہبی رہنماؤں تک کیوں جمہوری انتخابات میں حصہ لے کر عہدہ و منصب کے حصول کے لئے کوشاں رہتے ہیں؟ کیونکہ اسلام اور مسلمانوں کا کردار یہ دونوں ایک چیز نہیں، الگ الگ دو چیزیں ہیں۔ آج کل کے مسلمان تو ایسے بے شمار کام کرتے ہیں

جو اسلام کی صریح تعلیمات کے بالکل برعکس ہیں بلکہ ایسے اعتقادات تک انہوں نے اپنا لئے ہیں جو قرآن و حدیث کے واضح نصوص سے متصادم ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ ایسے غلط عقائد و اعمال، مسلمانوں کے اپنا لینے سے، اسلام کے عقائد و اعمال قرار نہیں پا جائیں گے۔ بلکہ وہ غلط ہی رہیں گے چاہے مسلمانوں کی اکثریت انہیں اختیار کرلے۔ اسی طرح جب عہدہ و منصب کی طلب یا اس کے لئے کوشش، اسلامی نقطہ نظر سے مستحسن امر نہیں ہے تو پاکستان میں علماء کے انتخابات میں حصہ لینے سے یہ غیر مستحسن امر، مستحسن نہیں بن جائے گا۔

عہدہ و منصب کی طلب اور اس کی آرزو کی مذمت بہت سی احادیث میں آتی ہے۔ جن میں ایک وہ مشہور حدیث بھی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حب جاہ اور حب مال کو دین کے لئے اس سے کہیں زیادہ تباہ کن قرار دیا ہے جتنی تباہی دو بھوکے بھیڑیوں سے بکریوں کے ریوڑ میں گھس جانے سے ہو سکتی ہے۔ اس حدیث کی صداقت و حقانیت آج روز روشن کی طرح دیکھی جا سکتی ہے۔

اب مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ اگر اپنے آپ کو عہدہ و منصب کے لئے پیش کرنا صحیح نہیں ہے تو کیا انتخابات کا سارا میدان اشرار کے لئے کھلا چھوڑ دینا چاہئے؟ اس کا جواب پھر لوگ یہ دیتے ہیں کہ نہیں، ایسا کرنا صحیح نہیں ہے، اس طرح تو پھر اشرار اور غیر صالح عناصر ہی کامیاب ہو کر حکومت کے دروبست پر چھا جائیں گے، اور یوں اپنے لئے انتخابات میں حصہ لینے کا جواز مہیا کر لیا جاتا ہے۔

لیکن اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو مذکورہ جواز "دل کے بہلانے" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ جمہوری انتخابات کا طریقہ بجائے خود غیر اسلامی ہے، اس میں حصہ لے کر کبھی بھی مفید نتائج حاصل نہیں کئے جا سکتے، اس لئے یہ جواز سخت محل نظر ہے۔ تجربات نے بھی اس حقیقت پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے کہ موجودہ طرز انتخاب سے اشرار کا طبقہ ہی ابھر کر سامنے آتا ہے اور کچھ نیک لوگوں کے اس میں حصہ لینے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اس لئے اسلام کی تعلیمات کی مٹی پلید کرنے سے بہتر یہی ہے کہ جب تک اسلام کی تعلیمات کے مطابق کوئی صحیح طرز انتخاب اختیار نہیں کیا جاتا، صلحاء و اتقیاء اور علماء کا اس سے اجتناب کرنا ہی بہتر اور اقرب الی الصواب ہے۔

۲۔ توتی الملک من تشاء و تنزع الملک ممن تشاء و تعز من تشاء و تذل من تشاء کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ جس کو حکومت و بادشاہت ملتی ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے راضی اور خوش ہے (جیسا کہ مکتوب نگار نے سمجھا ہے) کیونکہ اول تو یہ دنیاوی عزت و سرفرازی ہے جو اخروی عزت و سرفرازی کو مستلزم نہیں۔ ورنہ لازم آئے گا کہ تمام غیر مسلم بادشاہ اور حکمراں بھی عنداللہ نہایت معزز و محترم ہوں در آں حالیکہ اس کا کوئی بھی مسلمان قائل نہیں۔

ثانیاً مشیت الٰہی اور چیز ہے اور رضائے الٰہی چیزے دیگر۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، مشیت الٰہی کے ماتحت ہی ہوتا ہے، لیکن ظاہر بات ہے کہ وہ پسند سارے کاموں کو نہیں فرماتا، پسند وہ صرف انہی کاموں کو کرتا ہے جن کے کرنے کا اس نے حکم دیا ہے، حالانکہ ناپسندیدہ کام بھی ہوتے اس کی مشیت سے ہی ہیں، اس لئے اگر بھٹو صاحب وزیر اعظم بن گئے یا اب ان کی صاحب زادی پاکستان کی وزیر اعظم بن گئی ہیں، تو یہ بلاشبہ مشیت الٰہی کے ماتحت ہی ہوا ہے۔ لیکن مشیت، رضائے الٰہی کے ہم معنی نہیں ہے کہ اس کا مطلب یہ سمجھ لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ بھٹو صاحب یا محترمہ کے ساتھ خوش بھی ہے، کیونکہ اگر وہ ان سے خوش نہ ہوتا تو ان کو حکمراں کیوں بناتا؟ اس صغریٰ کبریٰ کے ملانے سے جو نتیجہ اخذ کیا گیا ہے اگر یہ صحیح ہے تو پھر تسلیم کرنا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ صدر امریکہ بش سے، برطانیہ کی وزیر اعظم مسز تھیچر سے، ہندوستان کے وزیر اعظم راجیو گاندھی سے بھی خوش ہے، کیونکہ اگر وہ خوش نہ ہوتا تو ان کو یہ حکمرانیاں اور سرفرازیاں کیوں عطا فرماتا؟

اس لئے قانون تکوینی اور قانون تشریعی دونوں کو گڈمڈ نہیں کرنا چاہئے کہ دونوں کا دائرہ الگ الگ ہے۔ دنیا میں جو کچھ بھی ہو رہا ہے، اچھا یا برا، قانون تکوینی کے تحت ہی ہو رہا ہے، لیکن یہ سب اس کی پسند اور رضا کے مظہر نہیں ہیں، اس کی پسند اور رضا تو صرف انہی کاموں سے حاصل ہو گی جو اس کے قانون تشریعی کی رو سے جائز اور صحیح ہیں۔

اس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے فلو شاء لھداکم اجمعین (الانعام۔ ۱۴۹) "اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو تم سب کو ہدایت نصیب فرما دیتا" دوسری جگہ فرمایا ولو شاء اللہ مااقتتلوا (البقرۃ۔ ۲۵۲) "اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو آپس میں نہ لڑتے" یعنی اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے تحت اس بات پر قادر ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہی کا راستہ اختیار کرنے سے اور باہم قتال و

جدال کرنے سے روک دے۔ لیکن وہ ایسا نہیں کرتا بلکہ اس کی مشیت سے ہی یہ سارے کام ہو رہے ہیں۔ لیکن کیا گمراہی کا راستہ اختیار کرنے اور قتال و جدال کو وہ پسند بھی فرماتا ہے؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے، کیونکہ پسند تو اس کی یہی ہے کہ ہدایت و اطاعت الٰہی کا راستہ اختیار اور قتال و جدال سے اجتناب کیا جائے۔

جب اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح طور پر اپنے قانون تشریعی کی وضاحت فرما دی کہ الرجال قوامون علی النساء (النساء۔ ۳۴) (مرد عورتوں پر حاکم ہیں) تو ہمارے نزدیک اس قانون کی خلاف روزی کرنے والوں سے اللہ تعالیٰ کبھی راضی اور خوش نہیں ہو گا تاآنکہ وہ اس قانون شکنی سے باز آ جائیں، کیونکہ اس کی رضامندی اس کے تشریعی قوانین کو مانے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ رہے تکوینی قونین، تو وہ تو ویسے ہی انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہیں، اللہ تعالیٰ ہی اپنے تکوینی قوانین کی حکمت و مصلحت بہتر سمجھتا ہے، تکوینی قوانین کے تحت ہی وہ اپنے فرماں بردار بندوں کے ساتھ ساتھ نافرمانوں کو بھی دنیا سے نوازتا ہے اور خوب نوازتا ہے، اپنے باغیوں کو بھی حکمرانیاں اور بلندیاں عطا فرماتا ہے اور اپنے دشمنوں کو بھی دنیاوی عزت و کامرانیوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ اس لئے کسی کے تاج و تخت سلطنت سے بہرہ مند ہونے کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب اور پسندیدہ بھی ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے بڑا خوش ہے۔

۳۔ البتہ مکتوب نگار کی یہ بات صحیح ہے کہ علمائے کرام "جمہوریت" کی حمایت کرنے اور جمہوری انتخابات میں حصہ لینے کی بجائے اگر عوام کی اصلاح کا کام کرتے تو زیادہ بہتر ہوتا تاکہ عوام برخود غلط قسم کے لوگوں کو ووٹ دے کر انہیں منصب حکمرانی پر فائز نہ کرتے۔

پاکستان کی بدقسمتی یہی ہے کہ یہاں مذہب پر سیاست غالب آ گئی، محدود مفادات کی چکاچوند نے ملک و ملت کے وسیع مفادات کو پس پشت ڈال دیا اور جاہ و منصب کے حصول کی خواہش اور دوڑ نے تعمیر ملت اور تطہیر افکار جیسے اہم فریضے سے رہنمایان قوم، وارثان منبر و محراب، اصحاب جبہ و دستار اور مدعیان حکومت الٰہیہ سب کو غافل کر دیا۔

سب سے پہلے بانی جماعت اسلامی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم نے اس غلطی کا ارتکاب کیا جس کے نتیجے میں جماعت کی قوت منتشر ہو گئی، مولانا مرحوم اپنے بہترین رفقاء سے محروم ہو گئے اور تعمیر و تطہیر کا جو کام اس جماعت کے ذریعے سے بتدریج ہو رہا تھا، وہ نذر سیاست ہو گیا۔ پھر یہ بیماری ــــ جسے بڑے بڑے خوش نما عنوانات دیئے گئے ــــ دیگر مذہبی جماعتوں میں بھی نفوذ کر

گئی اور وہ بھی آہستہ آہستہ تبلیغ و دعوت کے مقابلے میں سیاست اور اس کے ہنگاموں کو زیادہ اہمیت دینے لگیں اور نوبت بہ ایں جا رسید کو اب پورا جسد معاشرہ

تن ہمہ داغ دار شد پنبہ کجا کجا نہم

کا آئینہ دار ہے جس کے نتیجے میں تاریخ اسلام کا یہ بڑا المیہ رونما ہوا کہ جس پاکستان کو اسلام کے نام پر بنایا گیا تھا، اسی پاکستان میں اسلام کی صریح تعلیمات کے برعکس ایک عورت کو حکمرانی کے منصب پر فائز کر دیا گیا ہے۔ فانا للہ وانا الیہ راجعون۔ فلیبک علی الاسلام من کان باکیا

صلاح الدین یوسف۔ لاہور

۲۲ ستمبر ۱۹۸۹ء

عورتوں کا مطالبہ مساوات؟

سوال یہ ہے کہ کیا مساوات کا یہ جنون صحیح ہے؟ اور اس سے انسانی معاشرے میں کسی خوش گوار تبدیلی کے ابھر آنے کا کوئی امکان ہے؟

ان دو سوالوں کو حل کرنے کے لئے ہمیں کئی سمتوں میں سوچنا پڑے گا۔ سب سے پہلے قدرتاً مذہب کا زاویہ نظر سامنے آئے گا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج تک حوا کی کسی بیٹی کے ہاتھ میں اصلاح وہدایت کی باگ ڈور نہیں دی گئی یعنی کوئی عورت منصب نبوت پر فائز نہیں ہوئی۔

دوسری کسوٹی جس سے اس مطالبے کی صحت جانچی جا سکتی ہے، فطرت ہے۔ یہاں بھی مساوات کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ بلکہ اس کے برعکس عورت کی بناوٹ اور اس کے جسم کی ساخت اس ڈھب کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے فرائض مردوں سے قطعی مختلف ہیں۔ یہ ہر مہینے میں ایسے عارضے سے دو چار ہوتی ہے جس سے ذہن کی یکسوئی اور نفسیاتی اطمینان قائم رکھنا اس کے لئے دشوار ہو جاتا ہے ... پھر اگر بچے کو دو، سال کے لئے دودھ پلانے اور دیکھ بھال اور نگرانی کے فرائض بھی اس کے کندھوں پر ڈال دیئے جائیں تو وقت کی فراغتیں اور توجہ والتفات کی ارزانیاں یہ کہاں سے لا سکے گی کہ جس کے بل پر یہ کار زار عالم میں حصہ لے سکے۔ چلتے چلاتے تاریخ کی ورق گردانی بھی کر دیکھئے، کیا کبھی اس کی ذہنی صلاحیتوں نے اجازت دی ہے کہ یہ اصلاح ودعوت کا علم ہاتھ میں لے اور انسانی مشکلات کو دور کرنے کی سعی کرے

("الاعتصام" ۲۳ مارچ ۱۹۵۱ء از مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم)

حصہ دوم

حدیثِ دیگراں

گذشتہ صفحات میں ماسوائے پیر محب اللہ شاہ صاحب راشدی کے مکتوبات عالیہ کے، تمام مضامین راقم کے قلم سے ہیں۔ جو قارئین کرام کے ملاحظہ گرامی سے گزر چکے ہیں۔

آئندہ صفحات میں بعض دیگر اہل علم کی مفید تحریریں اور مقالات شامل ہیں جو مسئلہ زیر بحث کے کچھ ایسے گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں جو گذشتہ صفحات میں زیر بحث نہیں آ سکے۔ ہر مضمون پر فاضل مضمون نگار کا نام درج ہے۔

یوں امید ہے کہ یہ کتاب مسئلہ زیر بحث کے تمام ضروری گوشوں اور اہم پہلوؤں کو مُحیط اور مُتلاشیانِ حق کے لئے انشاء اللہ کافی ہوگی۔ بقول اقبالؒ ؎

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہئے

صلاح الدین یوسف

شیخ عبدالعزیز بن باز حفظہ اللہ ، مفتی اعظم سعودی عرب

اسلامی مملکت میں
خاتون کی حکمرانی، کسی طور پر جائز نہیں

سوال: اگر کوئی خاتون ملک کی وزیراعظم ، وزارت یا کسی اور بڑے منصب کے لئے بنفسِ نفیس خود کو پیش کرے تو شرع اسلامی الحنیف کا اس سلسلے میں کیا موقف ہے ۔ ازراہ کرم جواب دے کر ممنون فرمائیں۔؟

جواب: کسی خاتون کا ملک کا وزیراعظم بننا یا بنایا جانا یا کسی اور بڑے منصب پر تعین ، اسلام میں جائز نہیں ہے ۔ اس سلسلے میں قرآن حکیم ، سنّتِ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اجماع کی وضاحتیں بصراحت موجود ہیں ۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالی کا فرمان ہے کہ "الرجال قوّامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض"۔ اس آیت میں حکمِ عام ہے ۔ مرد کو اللہ تعالی نے قوام بنایا ہے ۔ خاندان میں بھی، ریاست میں بھی، اس آیت کریمہ سے صاف واضح ہے کہ مرد کو اللہ تعالی نے عورت پر افضلیت عطا فرمائی ہے ۔ اس میں عقل کی ، رائے کی اور ہر طرح کی افضلیت شامل ہے ۔۔۔۔ اور حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمیں بخاری شریف کی یہ حدیث ملتی ہے کہ وہ قوم تباہ و برباد ہوئی جس نے عورت کو اپنا حاکم اور سربراہ بنایا ۔ اس حدیثِ صحیح کے بعد اس بات میں کوئی شک نہیں رہتا کہ کسی خاتون کو صاحبِ امر بنانا یا اس کی تولیت میں مملکت کی زمامِ کار دے دینا احکامِ رسولِ کریمؐ کی کتنی بڑی خلاف ورزی اور جسارت کی بات ہے ۔ اس حدیث کی خلاف ورزی میں کسی ایسی حدیثوں کا متن بھی شامل ہو جاتا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جانتے بوجھتے سنّتِ رسولؐ کا بطلان کفر کی حدوں تک پہنچتا ہے اور صورتِ حال سے واقف ہونے کے بعد کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ احکامِ رسولؐ کی خلاف ورزی کرے ۔

اجماع کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ خلفائے راشدین اور ان کے بعد کی

تین صدیوں تک علمائے کرام کا عمل یہ رہا کہ کسی خاتون کو امارت یا عہدۂ قضا پر مامور نہیں کیا گیا ۔ اس دور کی خواتین میں اکثر ایسی تھیں جنہوں نے کتاب و سنت کی روشنی میں خود اس بات کی وضاحت فرمائی کہ خواتین کے لئے یہ مناصب مناسب نہیں ہیں ۔۔۔۔ اس کے علاوہ بھی شرعی احکام واضح ہیں ۔ حکامِ وقت کا بیشتر وقت دیگر مردوں اور عمالِ حکومت سے گفت و شنید ، دوروں، ملاحظوں، افواج کی قیادت و اجتماعات میں شرکت اور ان کی رہبری و رہنمائی اور خطبات و تقاریر میں گزرتا ہے ۔ انہیں دیگر ممالک کے دورے بھی کرنے ہوتے ہیں ، مختلف ممالک سے پیکٹ ہوتے ہیں ۔ اور دوسرے ملکوں کے صدور و وزراء اور سفراء کے معانقے، دعوتیں، غرض ایسے بے انتہا کام ہیں جن میں وزیراعظم ، صدر مملکت یا ملک کے اہم مناصب پر فائز لوگوں کو دن رات مشغول رہنا ہوتا ہے، اس لئے دینی، عقلی اور علمی کسی طرح مناسب نہیں کہ کسی خاتون یا خواتین کو ایسے مناصب دیئے جائیں جو ان کے لئے مناسب نہیں ہیں ۔

مزید برآں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی عقل کی روشنی میں بھی یہ بات بالکل واضح ہے کہ عورت کے مقابلے میں مرد کی عقل ، فہم، حسنِ تدبیر اور دیگر سارے قوائے جسمانی زیادہ بہتر ہیں ۔ لہذا ملک کے متذکرہ بالا اعلیٰ مناصب کے لئے مرد ہی زیادہ مناسب ہیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں دین حنیف اور سنّتِ رسولؐ کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے ۔ (عربی مجلہ "المجتمع" کویت سے تلخیص و ترجمہ) بشکریہ ہفت روزہ "تکبیر" کراچی

مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی ۔ کراچی

عورت کی سربراہی کے عدم جواز پر اُمّت کا اجماع ہے

قرآن و سنت کے دلائل کی وجہ سے چودہ صدیوں کے ہر دور میں امت مسلمہ کا اس بات پر اجماع رہا ہے کہ اسلام میں سربراہِ حکومت کی ذمہ داری کسی عورت کو نہیں سونپی جاسکتی ۔ اور اجماع امت شریعت کی ایک مستقل دلیل ہے ۔

اجماع کے ثبوت کے لئے ابن حزم کی یہ تحریر بڑی واضح ہے جسمیں وہ فرماتے ہیں ۔ واتفقوا ان الامامۃ لاتجوز لامرأۃ (مراتب الاجماع ۔ ص ۱۲۹) "اس بات پر تمام علماء متفق ہیں کہ حکومت کی سربراہی کا منصب کسی عورت کے لئے جائز نہیں ہے"

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ جیسے باخبر عالم نے "نقد مراتب الاجماع" کے نام سے علّامہ ابن حزمؒ کی مذکورہ کتاب پر ایک تنقید لکھی ہے ، اور بعض ان مسائل کا ذکر فرمایا ہے جنہیں علامہ ابن حزمؒ نے اجماعی قرار دیا ہے لیکن علامہ ابن تیمیہؒ کی تحقیق کے مطابق وہ اجماعی نہیں ہیں ، بلکہ ان میں کسی نہ کسی کا اختلاف موجود ہے ۔ اس کتاب میں بھی انہوں نے عورت کی سربراہی کے مسئلے میں علامہ ابن حزمؒ پر کوئی اعتراض نہیں کیا ۔ (دیکھئے نقد مراتب الاجماع،ص۱۲۶)

ان حضرات کے علاوہ جن علماء وفقہاء اور اسلامی ریاست کے ماہرین نے اسلام کے سیاسی نظام پر کتابیں لکھی ہیں ، ان میں سے ہر ایک نے اس مسئلے کو ایک متفقہ مسئلے کے طور پر ذکر کیا ہے ۔

علامہ ماوردی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب اسلامی سیاست کا اہم ترین مأخذ سمجھی جاتی ہے ۔ اس میں انہوں نے حکومت کی سربراہی تو کجا ، عورت کو وزارت کی ذمہ داری سونپنا بھی ناجائز قرار دیا ہے ۔ بلکہ انہوں نے وزارت کی دو قسمیں کی ہیں ۔ ایک وزارت تفویض جس میں پالیسی کا تعین بھی وزیر کا کام ہوتا ہے ۔ اور دوسری وزارتِ تنفیذ

جو پالیسی کا تعین نہیں کرتی بلکہ طے شدہ پالیسی کو نافذ کرتی ہے ۔ انہوں نے بتایا کہ وزارتِ تنفیذ میں اہلیت کی شرائط وزارت تفویض کے مقابلے میں کم ہیں ۔ اس کے باوجود وہ عورت کو وزارتِ تنفیذ کی ذمہ داری سونپنا بھی جائز قرار نہیں دیتے وہ لکھتے ہیں ۔

وأما وزارة التنفيذ فحكمها أضعف وشروطها اقل ۰۰۰ ولايجوز ان تقوم بذلك امرأة وان خبرها مقبول لما تضمنه معنى الولايات المصروفة عن النساء لقول النبى صلى الله عليه وسلم ما افلح قوم اسندوا امرهم الى امرأة ولأن فيها من طلب الرأى وثبات العزم ماتضعف عنه النساء ومن الظهور فى مباشرة الامور ماهو عليهن محظور۔ (الاحكام السلطانية ، ص ۲۵ تا ۲۷)

"جہاں تک وزارت تنفیذ کا تعلق ہے وہ نسبتۃً کمزور ہے اور اس کی شرائط کم ہیں ۰۰۰ لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ کوئی عورت اس کی ذمہ دار بنے ۔ اگرچہ عورت کی خبر مقبول ہے ۔ کیونکہ یہ وزارت ایسی ولایتوں پر مشتمل ہے جن کو (شریعت نے) عورتوں سے الگ رکھا ہے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "جو قوم اپنے معاملات کسی عورت کے سپرد کرے وہ فلاح نہیں پائے گی" نیز اس لئے بھی کہ اس وزارت کے لئے جو اصابتِ رائے اور اولوالعزمی درکار ہے ۔ عورتوں میں اس کے لحاظ سے ضعف پایا جاتا ہے ۔ نیز اس وزارت کے فرائض انجام دینے کے لئے ایسے انداز سے لوگوں کے سامنے ظاہر ہونا پڑتا ہے جو عورتوں کے لئے شرعاً ممنوع ہے ۔"

اسلام کے سیاسی نظام پر دوسرا اہم ماخذ امام ابو یعلی حنبلی ہیں ۔ انہوں نے بھی اپنی کتاب میں لفظ بہ لفظ یہی عبارت تحریر فرمائی ہے ۔

امام الحرمین علامہ جوینی رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کے سیاسی نظام پر بڑے معرکے کی کتابیں لکھی ہیں ، وہ نظام الملک طوسی جیسے نیک نام حاکم کے زمانے میں تھے اور انہی کی درخواست پر انہوں نے اسلام کے سیاسی احکام پر اپنی مجتہدانہ کتاب "غیاث الامم" تحریر فرمائی ہے اس میں وہ سربراہ حکومت کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

ومن الصفات اللازمة المعتبرة الذكورة والحرية و العقل والبلوغ ولاحاجة الى الاطناب فى نصب الدلالات على اثبات هذه الصفات (غياث الامم للجوينى ، ص۸۲ ، مطبوعه قطر)

" اور جو لازمی صفات سربراہ کے لئے شرعاً معتبر ہیں ان میں سے اس کا مُذکّر ہونا ، آزاد ہونا اور عاقل و بالغ ہونا بھی ہے ۔ اور ان شرائط کو ثابت کرنے کے لئے تفصیلی دلائل پیش کرکے طول دینے کی ضرورت نہیں ۔"

یہی امام الحرمین اپنی ایک دوسری کتاب "الارشاد" میں تحریر فرماتے ہیں :۔

واجمعوا أن المرأة لايجوز أن يكون اماما وان اختلفوا فی جواز كونها قاضية فيما يجوزشهادتها فيه ه

"اور اس پر سب کا اتفاق ہے کہ عورت کے لئے سربراہ حکومت بننا جائز نہیں ، اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ جن اُمور میں اس کی گواہی جائز ہے ان میں وہ قاضی بن سکتی ہے یا نہیں" [1]

علامہ قلقشندیؒ ادب وانشاء اور تاریخ و سیاست کے امام سمجھے جاتے ہیں ۔ انہوں نے اسلام کے اصول سیاست پر جو کتاب لکھی ہے اس میں انہوں نے سربراہ حکومت کی چودہ صفاتِ اہلیت بیان کی ہیں ، ان شرائط کے آغاز ہی میں وہ فرماتے ہیں ۔

الأول الذكورة ٠٠٠٠ والمعنى فى ذلك ان الامام لايستغنى عن الاختلاط بالرجال والمشاورة معهم فى الامور والمرأة ممنوعة من ذلك ولأن المرأة ناقصة فى امر نفسها حتى لاتملك النكاح فلاتجعل اليها الولاية على غيرها ه

پہلی شرط مُذکّر ہونا ہے ۔ اور اس حکم کی حکمت یہ ہے کہ سربراہ حکومت کو مردوں کے ساتھ اختلاط اور ان کے ساتھ مشوروں وغیرہ کی ضرورت پیش آتی ہے اور عورت کے لئے یہ باتیں ممنوع ہیں ، اس کے علاوہ عورت اپنی ذات کی ولایت میں بھی کمزور ہے ، یہاں تک کہ وہ نکاح کی ولی نہیں بن سکتی ، لہذا اس کو دوسروں پر بھی ولایت نہیں دی جاسکتی۔"

امام بغویؒ پانچویں صدی ہجری کے مشہور مفسر ، محدث اور فقیہ ہیں ، وہ تحریر فرماتے ہیں :۔

---

۱ ۔ الارشاد فی اصول الاعتقاد للامام الحرمین الجوینی ص ۳۵۹ و ص ۴۲۷ طبع مصر ۔

اتفقوا على أن المرأة لاتصلح أن تكون اماما ۔۔۔ لأن الامام يحتاج الى الخروج لاقامة امر الجهاد و القيام بامور المسلمين ۔۔۔ والمرأة عورة لاتصلح للبروز ۱

"اس بات پر اُمّت کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ حکومت نہیں بن سکتی ۔ کیونکہ امام کو جہاد کے معاملات انجام دینے اور مسلمانوں کے امور نمٹانے کے لئے باہر نکلنے کی ضرورت پڑتی ہے اور عورت پوشیدہ رہنی چاہئیے ۔ اس کا مجمع عام میں ظاہر ہونا درست نہیں ۔"

قاضی ابوبکر ابن العربی حضرت ابوبکرہؓ کی حدیث کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں :۔

وهذا نص فی أن المرأة لاتكون خليفة ولاخلاف فيه ۲

"اور یہ حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہوسکتی اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ۔"

علامہ قرطبیؒ نے بھی اپنی تفسیر میں ابن العربی کا یہ اقتباس نقل کرکے اس کی تائید کی ہے اور بتایا ہے کہ اس مسئلے میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ۳

اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں :۔

الرابع : الذكورية فلاتنعقد الامامة لامرأة و ان اتصفت بجميع خلال الكمال وصفات الاستقلال ۴

"سربراہی کی چوتھی شرط مذکر ہونا ہے ۔ لہذا کسی عورت کی امامت منقد نہیں ہوتی ۔ خواہ وہ تمام اوصاف کمال سے متصف ہو اور اس میں استقلال کی تمام صفات پائی جاتی ہوں ۔"

عقائد و کلام کی تقریباً تمام کتابیں امامت و سیاست کے احکام سے بحث کرتی ہیں اور سب نے مذکر ہونے کی شرط کو ایک اجماعی شرط کے طور پر ذکر کیا ہے ۔ علامہ تفتازانی لکھتے ہیں ۔

---

۱ ۔ شرح السنۃ للبغوی ص ۷۷ ج ۱۰ باب کراہیۃ تولیۃ النساء ۔ طبع بیروت ۱۴۰۰ھ

۲ احکام القرآن لابن العربی ، ص ۱۴۴۵ ج ۳ ۔ سورۃ النمل

۳ تفسیر القرطبیؒ : ص ۱۸۳ ج ۱۳ سورۃ النمل ۔

۴ فضائح الباطنیۃ للغزالی ص ۱۸۰ ماخوذ از عبداللہ الدمیجی الامامۃ العظمٰی : ص ۲۴۵

يشترط فى الامام ان يكون مكلفا حُرّاً ذَكَراً عدلاً (شرح المقاصد، ص۲۷۷، ج۲)

"سربراہ حکومت کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ عاقل بالغ ہو، آزاد ہو، مذکر ہو اور عادل ہو۔"

فقہاء و محدثین اور اسلامی سیاست کے علماء کے یہ چند اقتباسات محض مثال کے طور پر پیش کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ جس کتاب میں بھی اسلام میں سربراہی کی شرائط بیان کی گئی ہیں، وہاں مذکّر ہونے کو ایک اہم شرط کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ اگر کسی نے یہ شرط ذکر نہیں کی تو اس بنا پر کہ یہ عاقل و بالغ ہونے کی شرط کی طرح اتنی مشہور و معروف شرط تھی کہ اسے باقاعدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ ورنہ اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

عہد حاضر کے بعض محققین جنہوں نے اسلامی سیاست کے موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ وہ اس بات پر متفق ہیں کہ عورت کے سربراہ بننے کے عدم جواز پر امت کا اجماع ہے۔ چند اقتباسات ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد منیر عجلانی لکھتے ہیں۔

لانعرف بين المسلمين من أجاز خلافة المرأة فالاجماع فى هذه القضية تام لم يشذ عنه احد (عبقرية الاسلام فى اصول الحكم ص ۷۰ مطبوعة دارالنفائس بيروت ۱۴۰۵ھ)

"ہمیں مسلمانوں میں کوئی ایسا عالم معلوم نہیں ہے۔ جس نے عورت کی خلافت کو جائز کہا ہو۔ لہذا اس مسئلے میں مکمل اجماع ہے جس کے خلاف کوئی شاذ قول بھی موجود نہیں۔"

ڈاکٹر محمد ضیاء الدین الریس نے اسلام کے سیاسی احکام پر بڑی تحقیق کے ساتھ مبسوط کتاب لکھی ہے۔
اس میں لکھتے ہیں:۔

اذا كان قدوقع بينهم خلاف فيما يتعلق بالقضاء فلم يرو عنهم خلاف فيما يتعلق بالامامة بل الكل متفق على أنه لا يجوز أن يليها امرأة (النظريات السياسية الاسلامية ص ۲۹۴ ، طبع قاهره)

"اگرچہ فقہاء کے درمیان قضاء کے بارے میں تو اختلاف ہوا ہے (کہ عورت قاضی بن سکتی ہے یا نہیں) لیکن حکومتِ کی سربراہی کے بارے میں کوئی اختلاف مروی

نہیں ، بلکہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ کسی عورت کا سربراہی کے منصب پر فائز ہونا جائز نہیں ۔"

ڈاکٹر ابراہیم یوسف مصطفی عجو لکھتے ہیں ۔

مما اجمعت علیه الامة علی أن المرأة لایجوز لها ان تلی ریاسة الدولة (تعلیق تهذیب الریاسة و ترتیب السیاسة ، للقلعی ، ص۸۲)

"اس بات پر امّت کا اجماع ہے کہ عورت کے لئے ریاست کی سربراہی سنبھالنا جائز نہیں ۔"

عبداللہ بن عمر بن سلیمان الدمیجی لکھتے ہیں :۔

من شروط الامام ان یکون ذکرا ، ولا خلاف فی ذلك بین العلما

(الامامة العظمی عند اہل السنة : ص ۲۴۳)

"سربراہ حکومت کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مُذکّر ہو ۔ اور اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ۔"

عہد حاضر کے مشہور مفسر قرآن علامہ محمد امین شنقیطی رحمہ اللہ تحریر فرماتے ہیں :۔

من شروط الامام الاعظم کونه ذکرا ولاخلاف فی ذلک بین العلماء (اضواء البیان فی تفسیر القرآن بالقرآن ، ص ۶۵ ، ج ۱۔)

" امام اعظم (سربراہ حکومت) کی شرائط میں اس کا مذکر ہونا بھی داخل ہے اور اس میں علماء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے ۔"

اگر اس موضوع پر تاریخ اسلام کے ائمہ ، مفسرین ، فقہاء ، محدثین ، متکلمین اور اہل فکر و دانش کی تمام عبارتیں جمع کی جائیں تو یقیناً ان سے ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے ۔ لیکن یہ چند مثالیں یہ بات ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اس مسئلے پر علمائے اسلام کے درمیان اب تک چودہ صدیوں میں کوئی اختلاف نہیں رہا ۔

حافظ ابن جریر طبری کا مسلک

ہمارے زمانے میں بعض لوگوں نے مشہور مفسر قرآن حافظ ابن جریر طبریؒ کی

طرف غلط طور سے یہ بات منسوب کی ہے کہ وہ عورت کی سربراہی کے جواز کے قائل ہیں ۔ لیکن کوئی بھی شخص امام ابن جریرؒ کا کوئی اپنا اقتباس پیش نہیں کرتا ۔ ان کی تصانیف میں سے تفسیر جامع البیان تیس جلدوں میں چھپی ہوئی موجود ہے ۔ اس میں سے کہیں کوئی ایک فقرہ بھی کوئی اب تک نہیں دکھا سکا جس سے ان کا یہ موقف معلوم ہوتا ہو ۔ خود ہم نے بھی ان کی تفسیر کے ممکنہ مقامات پر دیکھا ، لیکن اس میں کہیں کوئی ایسی بات نہیں ملی ۔

اس کے علاوہ ان کی ایک کتاب "تہذیب الآثار" کی بھی کچھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں ، اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں مل سکی ۔

واقعہ یہ ہے کہ بعض علماء نے ان کا یہ مسلک نقل کیا ہے کہ وہ عورت کو قاضی بنانے کے جواز کے قائل ہیں ۔ بعض لوگوں نے اس بات کو غلط طور پر سربراہی کے جواز کے عنوان سے نقل کر دیا ہے ۔ چنانچہ قاضی ابوبکر ابن العربیؒ تحریر فرماتے ہیں ۔

وهذا نص فى ان لاتكون خليفة ولاخلاف فيه و نقل عن محمد بن جرير الطبرى امام الدين انه يجوز ان تكون المرأة قاضية ولم يصح ذلك عنه ، ولعله كما نقل من ابى حنيفة انها انما تقضى فيما تشهد فيه وليس بأن تكون قاضية على الاطلاق ولا بأن يكتب لها منشور ، بان فلانة مقدمة على الحكم الا فى الدماء والنكاح فانما ذلك كسبيل التحكيم اوالا ستبانة فى القضية الواحدة

(احکام القرآن لابن العربی : ص ۴۴۵ ۔ ج ۳ ۔)

"اور یہ حضرت ابوبکرہؓ کی حدیث اس بات پر نص ہے کہ عورت خلیفہ نہیں ہو سکتی ۔ اور اس مسئلے میں کوئی اختلاف نہیں ۔ البتہ امام محمد بن جریر طبریؒ سے منقول ہے کہ ان کے نزدیک عورت کا قاضی ہونا جائز ہے ۔ لیکن اس مذہب کی نسبت ان کی طرف صحیح نہیں ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مذہب ایسا ہی ہوگا جیسے امام ابوحنیفہؒ سے منقول ہے کہ عورت ان معاملات میں فیصلہ کر سکتی ہے ۔ جس میں وہ شہادت دے سکتی ہے اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ علی الاطلاق قاضی بن جائے ۔ اور نہ یہ مطلب ہے کہ اس کو قاضی کے منصب پر مقرر کرنے کا پروانہ دیا جائے اور یہ کہا جائے کہ فلاں عورت کو قصاص اور نکاح کے معاملات کے سوا دوسرے امور میں قاضی بنایا جا رہا ہے ۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو کسی مسئلے میں ثالث بنا لیا جائے ۔ یا کوئی ایک مقدمہ جزوی طور پر اس کے سپرد کر دیا جائے ۔"

امام ابن العربیؒ کی اس وضاحت سے مندرجۂ ذیل اُمور سامنے آتے ہیں :۔

(۱) سربراہی کا مسئلہ علیحدہ ہے اور قاضی بننے کا مسئلہ علیحدہ ۔

(۲) سربراہی کے مسئلے میں امام ابن جریرؒ سمیت تمام علماء کا اتفاق ہے کہ عورت سربراہ نہیں بن سکتی ۔

(۳) امام ابن جریر طبریؒ سے قاضی بننے کا جواز منقول ہے لیکن ان کی طرف اس قول کی نسبت بھی درست نہیں ۔

(۴) امام ابو حنیفہؒ یا ابن جریرؒ سے عورت کے مقدمات کا فیصلہ کرنے کا جو جواز منقول ہے ، وہ اس کو باقاعدہ قاضی بنانے سے متعلق نہیں ہے بلکہ جزوی طور سے بطور ثالث کوئی انفرادی قضیہ نمٹانے سے متعلق ہے ۔

بہرکیف ! اگر فقہاء کے درمیان کوئی تھوڑا بہت اختلاف ہے تو وہ عورت کے قاضی بننے کے بارے میں ہے ۔ سربراہ حکومت بننے کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ۔ چنانچہ امام الحرمین جوینی رحمتہ اللہ علیہ لکھتے ہیں :۔

والذکورة لاشك فی اعتبارها ومن جوز من العلماء تولی المرأة للقضاء فیما یجوز ان تکون شاهدة فیه احال انتصاب المرأة للامامة فان القضاء قدیثبت مختصا ، والا مامة یستحیل فی وضع الشرع ثبوتها علی الاختصاص (غیاث الامم للجوینی ۔ ص ۸۲-۸۳ ۔)

"سربراہی کے لئے مذکر ہونے کی شرط میں کوئی شک نہیں ہے اور جن علماء نے ان معاملات میں عورت کے قاضی بننے کو جائز کہا ہے کہ جن میں عورت گواہ بن سکتی ہے ۔ وہ بھی سربراہی کے لئے عورت کی تقرری کو ناممکن قرار دیتے ہیں ۔ اس لئے کہ قضاء کے بارے میں تو یہ ممکن ہے کہ اس کی حدود اختیار کو کچھ معاملات کے ساتھ خاص کر دیا جائے ، لیکن حکومت کی سربراہی کو شرعی اصول کے مطابق کچھ محدود معاملات کے ساتھ خاص کرنا ممکن نہیں"۔

حافظ نعیم الحق نعیم

پاکستان میں عورت کی سربراہی

اسباب اور ان کا علاج

۱۹۸۸ء کے نتائج اور ان نتائج کے منطقی نتیجے کے طور پر ایک ایسے کردار و عمل کی حامل عورت کا سربراہِ حکومت بنجانا، جس کردار و عمل کا حامل کوئی مرد بھی شرعی طور پر اس منصب کے لئے اہل قرار نہیں دیا جا سکتا ، ہمارے خیال میں ایک ایسا قومی المیہ اور سانحۂ فاجعہ ہے جو افسوسناک تو ہے لیکن حیرت زا اور تعجب انگیز ہرگز نہیں ۔

پہنچا دیا ہے عشق نے ہم کو جہاں نعیم
افسوس ہے تعجب و حیرت نہیں مجھے

یہ سانحہ افسوسناک اس لئے ہے کہ اس سے عالمِ اسلام میں پاکستان کا اسلامی تشخص اور اس کی عرفی حیثیت شدید طور پر مجروح ہوئی ہے ۔ کیونکہ عام طور پر پاکستان کو عالمِ اسلام کا سربراہ اور اسلام کا قلعہ تصور کیا جاتا ہے بلکہ ایسا باور کرانے کی کوشش بھی کی جاتی ہے اور کون نہیں جانتا کہ قیامِ پاکستان کے وقت اسلام ہی کو اس کی بنیاد قرار دیا گیا تھا ۔ چنانچہ ایسی صورت میں "اسلام کے قلعہ" میں اسلام ہی کی کھلی خلاف ورزی یقیناً افسوسناک ہے ۔

پاکستان میں صنفِ نازک کا سربراہِ حکومت بن جانا تعجب انگیز اس لئے نہیں ہے کہ تعجب ہمیشہ ان واقعات پر ہوتا ہے جو عام معمول و عادت سے ہٹ کر ہوں، جن کا پس منظر نگاہوں سے اوجھل ہو یا جن کے اسباب و علل تک عقل و خرد کی رسائی بآسانی ممکن نہ ہو ۔

اگر کوئی شخص کراچی کی طرف جانے والی گاڑی میں بیٹھا ہو اور وہ کچھ دیر بعد کراچی پہنچ جائے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے؟ ہاں ! اگر وہ کراچی کے بجائے پشاور پہنچ جاتا ہے تو یقیناً ہر کسی کو تعجب ہو گا ۔ تقریباً یہی حال ہماری انفرادی و معاشرتی اور اجتماعی و سیاسی زندگی کا ہے ۔ انفرادی زندگی میں ہماری حالت یہ ہے کہ ہم

خواہشات نفسانی کی گاڑی میں بیٹھ کر زن، زر، زمین کی منزل پانے کی کوشش کر رہے ہیں اور سیاسی زندگی میں ہم جمہویت کی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ اور اپنے وطن کو بزعم خویش ایک فلاحی ریاست بنانے میں لگے ہوئے ہیں۔

گویا من حیث المجموع ہم اپنی زندگی کی گاڑی کا رُخ مدّتِ دراز سے برطانیہ اور امریکہ کی طرف کئے ہوئے ہیں۔ لہذا اگر چالیس سال کے طویل سیاسی سفر کے بعد ہم کسی حد تک برطانیہ پہنچ گئے ہیں (کہ وہاں سربراہ مملکت بھی عورت ہے) تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ حیرت تو اس وقت ہوتی جب ہم جمہوریت کی گاڑی مس بیٹھ کر لندن اور واشنگٹن کے بجائے مکّہ اور مدینہ پہنچ جاتے۔

نیز جس ملک میں ریڈیو۔ ٹی وی، اخبارات، فلمی رسائل، روزناموں کے فلمی و خواتین ایڈیشن مختلف قسم کے ڈائجسٹ، آرٹ سنٹر، عریاں تصاویر کی نمائش، شاعر، ادیب اور یونیورسٹیوں کی مخلوط تعلیم اور دیگر ذرائع ابلاغ اپنی ہمہ وقتی خدمات اور کوششوں کے نتیجے میں عورت کو لوگوں کے اعصاب پر سوار کر چکے ہوں، وہاں سروں پر بھی اگر عورت سوار ہو جائے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ سر (دماغ) ہی اعصاب کا مرکز ہوتا ہے

ہند کے شاعر و صورت گرو افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اُوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اُسے تو اس سانحہ فاجعہ کا سببِ بعید یعنی بالواسطہ سبب کہا جاسکتا ہے۔ باقی رہا اس کا سببِ قریب یعنی بلاواسطہ سبب تو ہماری رائے کے مطابق وہ ہے ہمارا "لیلائے اسلام" اور "شیرینِ جمہوریت" سے بیک وقت ایک ہی جیسی محبت کرنا، نہیں نہیں بلکہ اسلام کے مقابلہ میں جمہوریت کو محبوب تر قرار دینا۔

چونکہ ہم اسلام اور جمہوریت دونوں کو اپنی سیاسی محبت کا مرکز قرار دے چکے ہیں اور دونوں محبوبوں کو خوش رکھنا بھی ضروری ہے۔ لیکن بد قسمتی سے ایک کو خوش کرتے ہیں تو دوسرا ناراض ہو جاتا ہے اور دوسرے کو خوش کرتے ہیں تو پہلا ناراض ہو جاتا ہے کیونکہ دونوں کے مطالب اور تقاضے اس قدر مختلف اور باہم متضاد ہوتے ہیں کہ ان کو بیک وقت پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم ان دونوں محبتوں کے نباہنے کے شوق میں تضاد فکری و عملی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں اور پھر ستم بالائے ستم

یہ کہ اس تضاد سے عملاً چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے ہمارے ہاں عام طور پر جمہوریت کو اسلام پر ترجیح دے دی جاتی ہے ۔ پاکستان کی چالیس سالہ سیاسی تاریخ سے اس کی بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں لیکن سردست ہم چند تازہ مثالیں پیش کرنے پر اکتفا کریں گے تاکہ سلسلۂ گفتگو زیادہ طویل نہ ہو جائے ۔ ذیل میں چند خبروں کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں:۔

۱ ۔ آج صوبائی اسمبلی میں ۔۔۔۔ مولانا منظور چنیوٹی نے کھڑے ہو کر کہا:
وزیراعظم بے نظیر بھٹو نے یہ تو ارشاد فرمایا ہے کہ ہر نماز کے وقت کاروبارِ زندگی بند ہو جائے گا ۔ لیکن کاش انہیں خود بھی نماز پڑھنے کی توفیق ہوتی ۔۔۔ مولانا چنیوٹی نے اپنے پوائنٹ آف آرڈر میں یہ بھی کہا کہ قرآن و سنت کی رُو سے کوئی عورت سربراہ مملکت نہیں ہو سکتی ۔ اس سلسلے میں انہوں نے قرآن مجید کی ایک آیت کا حوالہ بھی دیا ۔
سپیکر: چنیوٹی صاحب! آپ تشریف رکھیں ۔ یہ معاملہ طے ہو چکا ہے ۔
فاروق لغاری:۔۔۔ جناب سپیکر! معزز رکن نے محترمہ وزیراعظم پر بے جا اعتراض کیا ہے اور یہ کہہ کر اُن پر حملہ کیا ہے کہ کاش اُنہیں بھی نماز پڑھنے کی توفیق ہوتی! انہیں یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ عورت گھر میں نماز پڑھتی ہے اس کے لئے مسجد میں جانا صحیح نہیں ہوتا" ۔۔ (نوائے وقت ۱۳ دسمبر ۱۹۸۸ء)

۲ ۔ وفاقی وزیر عدل و انصاف مسٹر وسیم سجاد نے کہا ہے کہ آئینی طور پر خاتون ملک کی صدر اور وزیراعظم ہو سکتی ہے، اور ان کے خیال میں آئین کی اس دفعہ کو وفاقی شرعی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا ۔ (نوائے وقت ۲۶ نومبر ۱۹۸۸ء)

۳ ۔ ۔۔۔ آج یہاں نوائے وقت سے بات چیت کرتے ہوئے مولانا سمیع الحق نے بتایا کہ میں نے (صدر غلام اسحٰق خاں سے) ملاقات میں شرعی نقطہ نظر سے عورت کو وزیراعظم بنانے کی شدید مخالفت کی اور کہا کہ اسلامی نظریاتی ملک میں عورت کو وزیراعظم بنانے سے عالم اسلام میں ایک نئی مثال قائم ہو گی جسے علماء اور دینی قوتیں قومی المیہ سمجھتی ہیں ۔ اس لئے اگر پیپلزپارٹی کو اکثریت حاصل ہے تو وہ کسی مرد کو پارلیمانی لیڈر منتخب کرے ۔ تاہم صدر نے جواباً کہا کہ یہ بھی جمہوری عمل کا حصہ ہے ۔ سیاسی جماعت جسے چاہے پارلیمانی لیڈر منتخب کر سکتی ہے ۔ ہم جمہوری عمل کو روک

نہیں سکتے ۔ جمعیت کے رہنما نے کہا کہ آج جمہوریت کا دور دورہ ہے ۔ عورت کا وزیراعظم بننا مغربی جمہوریت کے تلخ ثمرات میں سے ایک ہے ۔ ہم جمہوریت کو اسلام کا پابند بنانا چاہتے ہیں ۔۔۔۔

(نوائے وقت یکم دسمبر ۱۹۸۸ء)

پہلی خبر پر غور کیجئے کہ پیپلزپارٹی کے فاروق لغاری ایک طرف تو عورت کو پردے کا اتنا پابند بنا رہے ہیں کہ اسے نماز کے لئے مسجد میں جانے کی بھی اجازت نہیں دینا چاہتے ۔۔ اور دوسری طرف اسی عورت کے لئے انتخابی مہم میں بے پردگی کے ساتھ بھرپور حصہ لینا ۔ غیر محرموں سے اختلاط اور پھر وزارتِ عظمیٰ کی کرسی پر براجمان ہونا جائز بلکہ بہت ضروری خیال کرتے ہیں ۔

اسی طرح اسلامی جمہوری اتحاد کے سپیکر اسمبلی ایک طرف اسلام کے نام پر الیکشن میں حصہ لے کر اسمبلی کے ممبر بنتے ہیں۔ اور دوسری طرف عورت کی سربراہی کا مسئلہ شرعی نقطۂ نظر سے اس لئے زیرِ بحث نہیں آنے دیتے کیونکہ یہ مسئلہ جمہوری اصولوں کے مطابق طے ہو چکا ہے ۔

دوسری خبر میں وسیم سجاد، جو اب اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر سینٹ کے چیئرمین بھی منتخب ہو چکے ہیں، قوم کو یہ مژدہ سنا رہے ہیں کہ عورت کی سربراہی کا مسئلہ اس قدر آئینی و جمہوری ہے کہ اسے شرعی عدالت میں بھی چیلنج نہیں کیا جا سکتا ۔ گویا آئین و جمہوریت شریعتِ اسلامیہ سے بالاتر ہیں ۔

تیسری خبر میں صدرِ مملکت نے تو گویا اس بات کی دو ٹوک تصریح کر دی ہے کہ اسلام اور جمہوریت کا جہاں بھی تصادم ہو گا وہاں جمہوریت اور آئین کو ترجیح دی جائے گی ۔ حالانکہ صدرِ مملکت صرف صدرِ مملکت ہی نہیں مسلمان بھی ہیں ۔ اگر آئین کی حفاظت ان کی ذمّہ داری ہے تو اسلام کی حفاظت بھی ان کا اسلامی فریضہ ہے ۔ آئین تو آنی جانی چیز ہے ۔ اسی دنیا میں رہ جائے گی ۔ جب کہ اسلام ایک اٹل حقیقت ہے جو اگلی دنیا میں بھی ان کے ساتھ جانے والی ہے ۔ اس اعتبار سے صدرِ مملکت کو سوچنا چاہیئے تھا کہ آئینِ پاکستان کے دیباچے میں قراردادِ مقاصد کو شامل کیا گیا یا کرایا گیا ہے ۔ جس میں اقتدارِ اعلیٰ کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کو قرار دیا گیا ہے ۔ آخر اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اسی طرح آئین مرتب کرتے وقت حزب اختلاف کی جانب سے پیش کردہ ان تجاویز

و ترامیم پر بھی غور کرنا چاہیئے تھا ۔ جن کو آئین کا حصہ بنایا گیا ۔ اور جن میں یہ صراحت بھی موجود ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہو گا اور قرآن و سُنت کے خلاف کوئی قانون نہیں بنایا جائے گا اور پہلے سے موجود قوانین کو قرآن و سنّت کے مطابق ڈھالا جائے گا ۔ اسی طرح اپنے پیشرو صدر ضیاء الحق کے شریعت آرڈی ننس کے مفہوم پر بھی غور کرنا چاہیئے تھا۔

اور سب سے بڑھ کر انہیں اس بات پر غور کرنا چاہیئے تھا کہ عورت کو سربراہِ مملکت نامزد کرنے سے کہیں اس حلف کی مخالفت نہ ہو جائے جسے دو مرتبہ خود اٹھا چکے ہیں اور جس کے بول ایک مرتبہ مسز بے نظیر بھٹو کی زبان سے بھی ادا ہو چکے ہیں ۔ کیونکہ حلف نامہ کی مخالفت (یا شہادۃ الزور) شرعی طور پر ان کبیرہ گناہوں میں شمار ہوتی ہے ۔جنہیں اکبر الکبائر (سب سے بڑے گناہ) کہا جاتا ہے ۔ جب صدر اور وزیراعظم دونوں کے حلف ناموں میں یہ الفاظ موجود ہیں کہ "میں اسلامی آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) کی حفاظت کروں گا" تو سوال یہ ہے کہ جناب صدر نے ایک عورت کو سربراہ حکومت نامزد کر کے اور مسز بے نظیر نے اس نامزدگی کو قبول کر کے کیا واقعی اسلامی آئیڈیالوجی کی حفاظت کی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ صدر اور وزیراعظم (یا وزیرۂ عظمیٰ) نے اپنے طرزِ عمل سے جہاں شرعی طور پر ایک کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا ہےوہاں انہوں نے اس بات کا ثبوت بھی فراہم کر دیا ہے کہ وہ واقعی اس تضادً فکری و عملی کا بری طرح شکار ہیں جس کا سطورِ بالا میں تذکرہ کیا گیا ہے ۔

ہمارے سیاسی لیڈر تو فکری و عملی تضاد کے شکار ہوئے ہی تھے لیکن افسوس تو اس بات پر ہے کہ جن مذہبی لیڈروں پر ہمارے سادہ لوح اور اسلام سے سچی محبت رکھنے والے عوام اعتماد کرتے ہیں ۔ ان کی دینی بصیرت بھی اس بارے میں جواب دے گئی ہے اور وہ بھی اپنے آپ کو اس فکری و عملی تضاد سے محفوظ نہیں رکھ سکے ۔ مولانا سمیع الحق کے درج بالا بیان سے یہی حقیقت مترشح ہو رہی ہے ۔

موصوف کا یہ فرمانا کہ عورت کا وزیراعظم بننا مغربی جمہوریت کے تلخ ثمرات میں سے ایک ہے ہم جمہوریت کو اسلام کا پابند بنانا چاہتے ہیں ۔ ہمارے خیال میں کسی حد تک اسی فکری تضاد کا مظہر ہے جو اسلام کے ساتھ جمہوریت کی پیوند کاری سے جنم لیتا

ہے ۔ بلکہ اس کی مثال تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی مسلمان کسی کافر ادا کافرہ و مشرکہ سے شادی پہلے کر لے اور اسے مسلمان کرنے کی فکر اور کوشش بعد میں کرے ۔

ہمارے خیال میں تو جمہویت کو کسی صورت بھی اسلام کا پابند نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ جمہوریت کو اگر اسلام کا پابند بنا دیا جائے تو جمہوریت ، جمہوریت نہیں رہتی ۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ اسلام کو جمہوریت کا پابند بنا دینے سے اسلام، اسلام نہیں رہتا ۔ تاہم سینیٹر موصوف یا دیگر مذہبی لیڈر جو جمہوریت کے پابندِ اسلام ہو جانے کے قائل ہیں ، اگر واقعی اسلامی جمہوریت کا کوئی واضح تصور اور قابل عمل خاکہ اپنے ذہنوں میں رکھتے ہیں ۔ تو ان کے لئے مناسب بلکہ انتہائی ضروری امر یہ ہے کہ وہ الیکشن میں عملاً حصہ لینے سے قبل الیکشن کے موسم میں اپنے مخصوص تصور جمہوریت کی دو ٹوک اور متفقہ انداز میں تشہیر کریں اور تمام سیاسی و حکومتی قوتوں پر متحدہ طور پر واضح کر دیں کہ ''ہم مغربی جمہوریت کے خلاف ہیں ۔ لہذا اس کے تحت ہونے والے الیکشن کو ہم غلط اور اس میں شریک ہونے کو ناجائز سمجھتے ہیں ۔ جب تک اسلامی جمہوریت کے تحت الیکشن نہیں ہوتے ہم الیکشن میں حصہ نہیں لیں گے''۔ اس صورت میں مغربی جمہوریت پر ان کی تنقید بھی حق بجانب سمجھی جائے گی ۔ ورنہ موجودہ صورتِ حال تو ہر معقول انسان کو مضحکہ خیز ہی لگے گی کہ عورت الیکشن مہم چلائے ۔ سرِ عام بے پردہ ہو کر نوجوانوں کے شانہ بشانہ تقریریں کرے اور پھر کامیاب ہو کر ممبر اسمبلی بن جائے تو کوئی اعتراض نہ ہو، لیکن جب بطور وزیرِ اعظم نامزد ہونے لگے ، تو اُسے قومی المیہ قرار دیا جائے اور اسلام کے حوالے سے اسے روکنے کی کوشش کی جائے ۔ یہ کھلا تضادِ فکری و عملی نہیں تو اور کیا ہے؟

آخر میں اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہمارے نزدیک اس تضاد فکری و عملی سے نجات پانے کے صرف دو ہی راستے ہیں ۔ ایک یہ کہ اسلام کو خیرباد کہہ دیں، پاکستان کی نظریاتی بنیاد سے منحرف ہو جائیں اور مکمل طور پر جمہوری بن جائیں ۔ اس کے بعد قومی سطح پر جو بھی نیا مسئلہ پیدا ہو اسے صرف جمہوریت کے حوالے سے حل کریں اور اسلام کا اس میں نام تک نہ آنے دیں ۔

دوسرا راستہ یہ ہے کہ جمہوریت کے بُت کو پاش پاش کر دیں، پاکستان کی نظریاتی بنیاد پر غیر مشروط ایمان ویقین پیدا کر لیں اور مکمل طور پر ''اسلامی'' بن جائیں ۔ اور

نئے پیدا ہونے والے ہر قسم کے مسائل اور مشاکل کا حل صرف اور صرف اسلام اور خالص کتاب و سنت کی روشنی میں حل کرتے چلے جائیں اور کسی کو قطعاً اس کی اجازت نہ دیں کہ وہ اسلام کے اصول و تعلیم اور خالص کتاب وسُنّت کے مقابلہ میں جمہوریت اور خود ساختہ آئین و دستور کے حوالے پیش کر کے ذہنی انتشار و تضاد اور دوعلمی و منافقت کی فضا پیدا کرے ۔

یقیناً مذکورہ دونوں راستوں میں سے کسی ایک پر گامزن ہو کر قومی سطح پر تضاد فکری و عملی اور منافقت سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے فرق صرف یہ ہے کہ پہلا راستہ کفر و ارتداد کا راستہ ہے، شیطان کا راستہ ہے، جو جہنم کی طرف جاتا ہے اور دوسرا راستہ ایمان و اخلاص کا راستہ ہے رحمان کا راستہ ہے ، جو سیدھا جنت کی طرف جاتا ہے ۔ أُوْلَئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ ۔

ہمارے خیال میں آیندہ الیکشن سے پہلے پہلے ہمارے سیاسی اور مذہبی لیڈروں کو دو ٹوک فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ وہ کس راستے کو پسند کرتے ہیں ۔ اور کس پر گامزن ہونا ملک و ملت کے لئے مفید سمجھتے ہیں ۔

مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے
ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں

ڈاکٹر سیّد محمد عبداللہ مرحوم ۔ لاہور

خواتین کی تعلیم اور ملازمت کا مسئلہ

امام غزالیؒ اور علّامہ اقبالؒ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے تھے ۔ یہ غلط فہمی دُور ہو جانی چاہیئے کہ وہ خدانخواستہ عورتوں کی تعلیم کے مخالف تھے ۔ وہ مخالف ہرگز نہ تھے وہ بس یہ چاہتے تھے کہ عورتیں صرف وہ تعلیم حاصل کریں جو ان کی فطرت ۔ خلقت اور فرائضِ مخصوص کے مطابق زندگی میں ان کے اور خاندان کے کام آئے اور صحیح یہ ہے کہ قدرت نے عورتوں کے لئے الگ دائرہ کار مقرر کیا ہے جس کی تشریح کی یہاں ضرورت نہیں کیونکہ یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ بے شمار کام ایسے ہیں جو مرد نہیں کر سکتے اور لاتعداد کام ایسے ہیں جو عورتوں کی طاقت سے باہر ہیں لہذا ہر گروہ کو ان کے کاموں کی نسبت سے تعلیم دینی چاہیے یہ اعلیٰ اور ادنیٰ تعلیم کا معاملہ نہیں بلکہ ہر کسی کو اس کے مزاج اور فطری تقاضوں کے مطابق مناسب تعلیم دینے کا مسئلہ ہے اور یہ خیالات صرف غزالیؒ اور اقبال ہی کے نہیں خود سرسید احمد خاں کے بھی ہیں جو مغربی انداز کے ہمارے یہاں اولین بڑے علمبردار تھے ۔ سرسید احمد خاں کی یہ سرگزشت دیکھنی ہو تو ان کا سفرنامہ پنجاب مرتبہ سید اقبال علی پڑھیے ۔

اور جہاں تک مخلوط تعلیم کا تعلق ہے مذکورہ بالا بزرگ اور دوسرے ہزاروں علماء و حکماء اسے خطرناک سمجھتے تھے کیونکہ اس کا ان معاشرتی و اخلاقی احکام سے تصادم ہے، جو قرآن مجید میں مذکور ہیں یا جن کا اُوپر ذکر آیا ۔ یہ امر عورتوں پر پابندی یا سختی کے ضمن میں نہیں آتا، اس میں عورتوں کے لیے برکتیں اور حکمتیں ہیں ان میں سب سے بڑی حکمت عورتوں کا معاشرتی تحفظ، ان کی عزت کی حفاظت اور خاندانی زندگی کا استحکام ہے ۔

عورتوں کو ہر سطح تک تعلیم دی جا سکتی ہے بشرطیکہ مذکورہ بالا مصلحتوں اور حکمتوں کو گزند نہ پہنچے اور یہ سب عورتوں کے فائدے کی خاطر ہے ان پر زیادتی نہیں ۔

مخلوط تعلیم اور یکساں نصاب پر بحث کی ضرورت نہیں اس کا صحیح نقصان سب کو معلوم ہے لیکن اگر تعلیم مخلوط نہ ہو تو عورتوں کو اختیار دیا جائے کہ وہ ہر شعبہ تعلیم میں جسے وہ اپنے لیے مفید سمجھتی ہیں داخلہ لے لیں یعنی ان سب شعبوں میں جو انہیں اپنے لیے مفید نظر آئیں یا معاشرے کے لیے مفید ہوں لیکن مخلوط ملازمتوں کا مسئلہ جدا ہے مخلوط ملازمتوں کے سلسلے میں جو قباحتیں ہیں وہ ہر کسی کو معلوم ہیں ۔

ظاہر ہے کہ عورتیں اپنے لیے جن مضامین کو مفید خیال کریں گی ان میں اکثر ایسے ہوں گے جو مردوں کے لیے بیگانہ اور نامانوس ہوں گے اس لیے اگر عورتوں کی تعلیم کا نظام یکسر علیحدہ ہو گا ۔ تب جا کر انہیں فائدہ ہو گا ۔ اس کا واحد علاج عورتوں کے لیے بالعموم الگ نصابات اور ایک الگ خواتین یونیورسٹی ہے مردوں اور عورتوں کے لیے یکساں نصاب کا فلسفہ غیر قدرتی اور غیر معقول ہے یہ بات اور ہے کہ آج کی دنیا میں اس غیر معقول فلسفے کو اپنایا جا رہا ہے اگرچہ اس میں عورتوں کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے لیکن رواج عام کا غلبہ زبردست شے ہے اس کے سامنے ہر کوئی دب جاتا ہے اس رواج کو تبدیل کرنے کے لیے ایک معاشرتی انقلاب کی ضرورت ہے مگر ایسا انقلاب کوئی آسان کام نہیں ، سب سے پہلے فکری تبدیلیوں کی ضرورت ہے اور یہ تبدیلیاں مغربی معاشرتی فلسفوں پر مسلسل و منظم تنقید کرتے رہنے سے اور عملی تجربوں کے حوالے سے ان کے خطرات سے آگاہ کرتے رہنے سے ممکن ہوں گی جب تک ہمارے یہاں مغربی معاشرتی فلسفہ غالب ہے ہماری سب دلیلیں بے کار و بے اثر ہوں گی لہٰذا بقول علّامہ اقبال مغربی معاشرتی حکمت پر بھرپور حملہ (علمی ہتھیار سے) لازمی ہے ۔

ملازمتوں میں عورتوں کی شرکت ایک اہم اور نازک معاشرتی افکار کے زیر اثر نقطہ نظر کے بدل جانے کا نتیجہ ہے اگر ہم اس معاملے میں اسلام کی معاشرتی حکمتوں سے ہدایت لیں تو ہمیں اس شرکت میں بے شمار قباحتیں نظر آئیں گی بلکہ آج کل کے حالات میں ملازمت بڑی حد تک غیر اخلاقی اور نامناسب نظر آئیگی کیونکہ اسلام کی معاشرتی حکمت میں عورتوں کا فرض بچوں کی پرورش اور خانہ داری ہے اور اس کے بدلے مردوں کا فرض عورتوں (بیویوں) کی معاشی کفالت ہے تاکہ وہ بے فکر ہو کر اپنے دائرے میں خاندان کی خدمت کر سکیں یہ خدمت ایک بہت بڑا منصب ہے اور جیسا کہ بعض روشن

خیال حضرات باور کراتے ہیں ، یہ کوئی کمتر فریضہ نہیں بلکہ اصل تعمیرِ انسانیت اسی فریضے میں مضمر ہے اور اس کی انجام دہی میں مرد کا کام (اگر ان اصطلاحوں میں سوچیں تو) خادم کا ہے جو بنی نوع کی اس معمار (بیوی) کو اس کے اہم فریضے کی ادائیگی کے قابل بناتا ہے ۔ اس عمل یا دو طرفہ عمل میں عورت کا درجہ بلند تر ہے شوہر کا درجہ دوسرے نمبر پر آتا ہے مگر مغربی معاشرتی تصورات نے اس تقابل کو منقلب کر کے معاملہ زیر و زبر کر دیا ہے ۔

یہ تو تھا اصولی عقیدہ ایک مسلمان کی حیثیت سے لیکن سوال آجکل کے حالات کا ہے اس لیے موجودہ حالات میں عورتوں کی ملازمت کے جواز یا عدمِ جواز پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے ۔

پہلے اس سوال کا جواب چاہیے کہ عورتیں ملازمتوں کی شائق یا طلب گار کیوں ہیں؟ مغربی ماحول میں تو ان کا شوقِ ملازمت اس لیے ہے کہ وہاں خاندان اور گھر کا تصور ایک فرسودہ عمل ہے ۔ عورتیں نہ صرف ہم مرتبہ ہونے کا دعوی کر کے گھریلو آزادی کی طلبگار ہیں بلکہ معاشی طور سے آزاد ہو کر ان تمام بندشوں سے بھی آزاد ہوجانا چاہتی ہیں جو خاندانی زندگی میں ان پر عائد ہوتی ہیں ، وہ خود کفیل ہو کر ہم رنگ آزاد شہری بننا چاہتی ہیں اس میں انہیں ہزار مشکلات بھی پیش آتی ہیں لیکن وہ آزادئ کامل کے لیے ہر مشکل کو برداشت کرتی ہیں ۔

لیکن اس میں انہیں ایک آسانی بھی ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ معاشرہ اس مسئلے میں ان کا ہم خیال ہے اور ہر چند کہ اس میں بے اخلاقی کے سارے عیب پائے جاتے ہیں لکین وہ معاشرہ ان خلافِ اخلاق باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دیتا لیکن ہمارے ملک میں ایک مسلم خاتون کی مشکل یہ ہے کہ ہمارے مسلم معاشرے کے نزدیک ملازمت ، غیر مردوں سے خلا ملا ہر حال میں ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے ۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ایک مسلمان عورت ملازمت کی طرف کیوں راغب ہوتی ہے؟ اس کے کئی اسباب ہیں جن میں سے بعض واقعی قابل توجہ ہیں اگرچہ عمومی رویہ محض مغرب کی نقالی سے ابھرا ہے مغرب کی تقلید میں ہماری انتہا پسند خواتین عورتوں کی کامل آزادی کی قائل، مردوں کی ہر قسم کی بالادستی کی مخالف اور ان کی ہر قسم کی دست نگری سے گریزاں ہیں یہ مغربی تعلیم اور نقالی کا نتیجہ ہے اور تسلّی کا پہلو صرف یہ ہے

کہ یہ ابھی سرمایہ دار ، بورژوا اور دانشور طبقے تک محدود ہے اور معاشرے میں ان طبقات کے خلاف ایک گونہ تعصب بھی موجود ہے ۔

بایں ہمہ عورتوں میں ملازمت کا میلان بڑھ رہا ہے اور اس کے کئی اسباب ہیں، جن میں عورتیں حق بجانب معلوم ہوتی ہیں اور یہ اسباب قابل تجزیہ ہیں ۔

ایک بڑا سبب عورتوں کا یہ خوف ہے کہ معلوم نہیں کہ شادی کے بعد مرد حضرات کس وقت ان سے بے وفائی پر اُتر آئیں اور دوسری شادی کر کے پہلی بیوی کو بے سہارا چھوڑ دیں اور سچ یہ ہے کہ مردوں کا یہ رویہ اور عورتوں کا یہ خوف ہر دو مفروضے فرنگی تہذیب کے آوردہ ہیں تعدُدِ ازواج پہلے بھی تھا مگر مردوں کی روش کفالت کے معاملے میں غیر ذمہ دارانہ نہیں تھی ۔ سارا خاندان اس کے باوجود متوازن چلتا تھا شادی ایک مقدس عہدنامہ تھا جس کا بہرحال پاس رکھا جاتا تھا اور اس کی پاسداری کرانے میں خاندانوں کا بڑا حصہ تھا پہلی بیویاں بے سہارا نہ رہتی تھیں ان کے خاندان پرورش کرتے تھے ۔ لیکن مغربی فکر میں پلا ہوا مرد انفرادیت اور فردیت کا قائل ہے اور آزاد زندگی کا خواہاں ہے برا ماننے کی بات نہیں عورتوں کے ساتھ بدسلوکی بھی زیادہ تر تعلیم یافتہ لوگ ہی کرتے ہیں جس کے باعث عورتیں بالعموم خائف ہیں اور انہیں اپنی معاشی کفالت کا آزاد انتظام ضروری معلوم ہوتا ہے یقیناً اس میں کچھ وہم اور کچھ مغربی پروپیگنڈے کا اثر بھی ہے لیکن خوف حقیقی بھی ہے اور اس میں ذمہ داری مردوں کی زیادہ ہے ۔

جب تک یہ خوف اور وہم ہے اور اس مغربی رواج کو قبول عام حاصل ہے ۔ جسے اب ہمارے ملک کے تعلیم یافتہ طبقے نے مستحکم کر دیا ہے عورتیں ضرورتاً یا بے ضرورتاً ملازمت کی طلب گار رہیں گی خصوصاً جبکہ عورتوں میں اعلیٰ تعلیم کی شرح مردوں کے برابر بلکہ زیادہ ہوتی جاتی ہے ورنہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی جدوجہد اور مقصد کوئی نہیں ۔ ان میں سے اکثر گھریلو زندگی کو بوجھ خیال کرتی ہیں اور جب سے شانہ بشانہ کا افسانہ چلا ہے ملازمتوں کی ترغیب اور بھی زیادہ ہو گئی ہے اور تعجب ہے کہ صدیوں سے رائج خانگی زندگی میں عورتوں کی اندرون خانہ خدمت اور فرض کی بجاآوری کو بے کاری کا نام دیا جا رہا ہے حالانکہ موجودہ روش درحقیقت بیکاری کے برابر ہے کیونکہ اس سے گھر اور خاندان ویران ہو رہے ہیں ۔

اگلے زمانے کی عورتیں خاندان (گھر) کی زندگی کا بڑا بوجھ اٹھاتی تھیں اسے بیکار کہنا حماقت و جہالت سے کم نہیں ایک خیال یہ بھی چل نکلا ہے کہ ملازمتوں کے ذریعے گھر کی آمدنی میں اضافہ ہوتا ہے یہ افسانہ ہے کیونکہ عورتوں کی گھر سے عدم موجودگی کی وجہ سے ملازم رکھنے پڑتے ہیں جو عام خاندانوں کے بس کی بات نہیں ۔

عُلمائے کرام نے عورت کی حکمرانی کے جواز میں کبھی فتویٰ نہیں دیا ۔

لاہور ۴ مارچ ۔ جمعیت علمائے اسلام (درخواستی گروپ) کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل مولانا زاہد الراشدی نے وزیر اعظم مسز بے نظیر بھٹو کے نام اپنے ایک مراسلے میں ان کے اس موقف کو کہ ۱۹۶۰ء میں علمائے کرام نے عورت کی حکمرانی کے جواز میں فتوئے دیا تھا ، غلط قرار دیتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ علمائے کرام نے کسی دور میں بھی عورت کے حکمران ہونے کے جواز میں فتویٰ نہیں دیا ۔ ۱۹۵۱ء میں دیو بندی ۔ بریلوی اہلحدیث اور شیعہ مسلک سے تعلق رکھنے والے ۳۱ علماء کرام نے جن ۲۲ دستوری نکات کا متفقہ طور پر اعلان کیا تھا ان میں یہ صراحت موجود ہے کہ حکمران کے لئے مسلمان ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا مرد ہونا بھی ضروری ہے ۔ ۱۹۶۰ میں بھی تینوں بڑے مذہبی مکاتب فکر (دیو بندی ، بریلوی ۔ اہلحدیث) کے علماء کرام نے محترمہ فاطمہ جناح کی حمایت سے اس وجہ سے انکار کر دیا تھا کہ عورت شرعاً مسلم ملک کی حکمران نہیں بن سکتی ۔ ۱۹۷۳ء میں بھی اس ضمن میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ عورت کا حکمران بننا شرعاً جائز نہیں مگر پیپلز پارٹی نے دستور ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل بوتے پر یہ تجویز مسترد کر دی تھی۔ صدر ضیاء الحق مرحوم کی قائم کردہ مجلس شوری میں جو آئینی کمیٹی قائم کی گئی تھی اس کی رپورٹ میں بھی قاضی عبداللطیف کا یہ اختلافی نوٹ موجود ہے کہ حکمران کے لئے مسلمان مرد ہونے کی شرط ضروری ہے اس لئے وزیر اعظم کا کراچی میں اپوا کی طرف سے اپنے اعزاز میں دیئے گئے استقبالیے میں یہ کہنا کہ علماء عورت کی حکمرانی کے جواز میں فتویٰ دے چکے ہیں تاریخی لحاظ سے درست نہیں (روزنامہ "نوائے وقت" ۵ مارچ ۱۹۸۹ء)

ڈاکٹر سید محمد عبداللہ مرحوم ۔ لاہور

"قوم کی نصف آبادی بیکار"۔۔۔ افسانہ یا حقیقت؟

ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ

مقالے کا عنوان میں نے ماضی قریب میں ہونے والی خواتین کانفرنس کی ایک قابلِ احترام مقرر خاتون سے لیا ہے ۔ انہوں نے فرمایا کہ ہماری قوم کی آبادی کا نصف حصہ بے کار ہے، اسے قومی تعمیر میں مکمل حصہ دار بنانا چاہئیے ۔

محترم خاتون کے ارشاد کا دوسرا حصہ بالکل درست ہے لیکن پہلے حصے کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس پر اعتراض کیا جا سکتا ہے اس بنیاد پر کہ انہوں نے مسلم معاشرے کو بدنام کرنے میں اہل مغرب کی مغالطہ انگیز مہم میں نادانستہ شرکت کی ہے ۔ میں نے اسے بدنام کرنے کی مہم اس لیے کہا ہے کہ قوم کے نصف حصے کو بیکار کہنا حقیقت کے خلاف ہے غالباً خاتون محترم کہنا یہ چاہتی ہیں کہ خواتین کی اکثریت موجودہ تعلیم سے عاری اور غیر ملازمت پیشہ ہے اور اس حد تک بات غلط نہیں ، درست ہے ۔ مگر یہ کہنا کہ مسلمان عورتوں کی اکثریت بیکار ہے اور ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہے ۔ سراسر تہمت اور بہتان ہے ۔ بالکل فارغ ہونے کی بات اگر درست ہے تو صرف ان گھرانوں کے بارے میں جو آسودہ حال، سرمایہ دار اور جاگیردار یا مفادات و رعایاتِ زندگی سے بہرہ ور لوگ ہیں ۔ ایسے گھرانوں میں نوکر چاکر بکثرت ہوتے ہیں اور خواتین تو کیا خود مردوں کے پاس کوئی مفید پیداواری کام نہیں ہوتا مگر دیہاتوں میں بسنے والی کروڑوں اور شہروں کی غریب متوسط اور نیم متوسط خواتین کا یہ حال نہیں ۔ وہ قومی زندگی (خاندان کی تعمیر اور گھر)کو آباد رکھنے میں نہایت نتیجہ خیز اور قابل صد تحسین کام انجام دیتی ہیں ۔ لہذا انہیں بیکار کہنا ان پر سخت زیادتی ہے ۔

میں عورتوں کی تعلیم اور ان کی ملازمت دونوں کا حامی ہوں بلکہ یوں کہو تو بہتر

ہو گا کہ ان کی موزوں تعلیم کو فرض عین اور بشرطِ ضرورت ان کےلیے ملازمت کو ایک مجبوری سمجھتا ہوں جس کی ذمے داری اُس خوف پر ہے جو عورتوں کے دل میں مردوں (شوہروں) کے بارے میں پیدا کر دیا گیا ہے یا ہوتا ہے اس کے باوجود میں یہ نہیں مان سکتا کہ گھر اور خانہ داری کی مصروفیات معمولی ، حقیر اور بیکاری کے مترادف ہیں ۔ میرے خیال میں یہ کہنا کہ قوم کا نصف حصہ بے کار ہے تہمت بھی ہے اور افسانہ بھی ۔ تہمت اس لیے ہے کہ قوم کی حقیقی معمار (بچوں کی پرورش اور تربیت کرنے والی) آبادی کے خلاف یہ شرمناک طنز ہے جس میں تحقیر کا پہلو پایا جاتا ہے اور افسانہ اس لیے ہے کہ یہ حقیقت کے خلاف ہے ۔ وہ کروڑوں عورتیں جو دیہات میں رہتی ہیں ۔ تربیتِ اطفال اور خانہ داری کے علاوہ بھی مردوں کے معاشی مشاغل میں شریک ہوتی ہیں چنانچہ ہماری آخری مردم شماری میں اس قسم کا اشتراک ساٹھ اور ستّر فیصد کے برابر قرار دیا گیا ہے ۔ پس کیا ہم ایسی اولوالعزم دیہاتی عورتوں کو "بے کار" کے تحقیری لفظ سے یاد کر سکتے ہیں ۔ ہرگز نہیں ۔ یہ دراصل سرمایہ دارانہ ذہن اور قوم کے سرمایہ دار طبقے کا اپنی بے کاری کو چھپانے کا پردہ (کاموفلاژ) ہے یا پھر مغرب کے خیمہ بردار طبقے کی تقلیدی آواز ہے جو ہمارے ملک میں معاشرتی انارکی پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ تحقیر کا یہ انداز بظاہر اس دلیل پر بھی مبنی ہے کہ یہ شہری خواتین اپنی دیہاتی بہنوں کو تعلیم سے عاری کہہ کر انہیں اپنے سے کم تر سمجھتی ہیں ۔

اس میں شبہ نہیں کہ تعلیم یافتہ ہونا تعلیم یافتہ نہ ہونے سے بہتر اور برتر ہے اور ہم تعلیم نسواں کو فرض عین قرار دے چکے ہیں لیکن ہم اس دلیل کو فی الحال ماننے کے لیے تیار نہیں کہ تعلیم یافتہ خواتین بہتر خانہ دار ثابت ہوتی ہیں اور ہر کوئی جانتا ہے کہ براہِ راست ذمے داری کا بوجھ غیر تعلیم یافتہ خواتین صدیوں سے اٹھا رہی ہیں اور ان کے نتائج میں یہی ایک دلیل کافی ہے کہ انہی عظیم المرتبہ خواتین نے غزالی، رازی، بوعلی سینا اور اقبال جیسے لوگ پیدا کئے اور بڑی کثیر تعداد میں عظیم افراد پیدا کیے ۔ مغربی خواتین کا ایک حصہ بھی پرورشِ اطفال کو ضروری سمجھتا ہے مگر براہِ راست ذمے داری کو اب وہاں بوجھ سمجھا جانے لگا ہے اب پرورش و تربیت کے مصنوعی اور غیر فطری طریقے نکل آئے ہیں ۔ اور یہ کام اداروں کے سُپرد ہونے لگا ہے "مادری" ذمے داریاں اب ناگوار ہیں لیکن ہماری قوم کی خواتین کا بیشتر حصہ (خصوصاً غیر سرمایہ دار طبقوں میں) براہِ راست مادری ذمے داریوں کو پورا کرتا ہے ۔ انہیں بے کار کہنا قوم کی توہین

ہے ۔ یہ درست ہے کہ انہیں تعلیم یافتہ ہونا چاہیے تھا لیکن یہ قصور قومی نظام تعلیم کا ہے جو عورتوں کا تو کیا، بجائے خود، مردوں کی تعلیم کا بھی اطمینان بخش انتظام نہیں کر سکتا پھر اس کی ذمے داری غریبی اور مفلسی پر بھی ہے اور یہ اس وجہ سے ہے کہ قومی معاشی نظام، سرمایہ داری کے غیر مساواتی اصولوں پر مبنی ہے تو اس صورت میں دیہاتی عورتوں کا کیا قصور ہے؟

اب رہی بے کاری کی دوسری شق یعنی یہ خیال کہ گھر کا انتظامِ داخلی اور خانہ داری گویا کوئی کام ہی نہیں، بڑی بھاری لاعلمی اور بے خبری کا غماز ہے ہماری رائے میں وہ خواتین جو گھروں کا انتظام کرتی ہیں عظیم المرتبہ اور بلند سیرت خواتین ہیں جن سے گھروں میں آرام اور سکون و اطمینان قائم ہے اس کے علاوہ براہِ راست ذمّے داری سے خاندانوں میں الفت و یگانگت اور قوم کے محنت کش پیداواری طبقے (مردوں) کے لیے زندگی کی راحت اور قوت مہیا ہوتی ہے اور وہ مرد احسان فراموش ہیں جو بیویوں کے اس عظیم کردار کی قدر نہیں کرتے اور قوم کی محسن ہیں وہ خواتین جو اس بارِ گراں کو بخوشی برداشت کرتی ہیں جو فطرت نے اور پھر اسلام نے ان پر یوں ڈالا کہ تدبیر منزل کو داخلی اور خارجی دو حصوں میں تقسیم کر کے تمدن کی گاڑی کو رواں رکھنے میں انسانیت پر احسان کیا ۔

مسئلہ یہاں ملازمت کا بھی چھیڑا جا سکتا ہے جسے میں نے سابقہ بیانات میں ضروری و پسندیدہ اور بعض صورتوں میں مجبوری قرار دیا ہے (۱) ۔ لیکن یہ خانہ داری کی زندگی سے الگ مسئلہ ہے اور اس کے بہت سے پہلو ہیں لیکن اشارتاً یہ ضروری ہے کہ یہ بھی ایک نظام اور تنظیم کا طلب گار ہے جسکی بنیاد خانہ داری کی عقلی دلیلوں اور اخلاقی مصالح پر رکھنی پڑے گی ۔ ملازمت بے ضرورت اور محض برائے ملازمت، آگے چل کر تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کی بیروزگاری جیسے مسائل اور باہمی مقابلہ اور رقیبانہ مسابقت پیدا کر سکتی ہے ۔

بہرحال اس وقت مجھے ثابت یہ کرنا تھا کہ ہماری قوم کا نصف حصہ اس لائقِ صد احترام خاتون کے خیال کے برعکس جس نے نصف آبادی کو بیکار کہا تھا ، بیکار نہیں ۔ یہ پروپیگنڈا اور افسانہ ہی افسانہ ہے ۔ (بشکریہ ''نوائے وقت'' لاہور ۳ نومبر ۱۹۸۱ء)

---

۱ ۔ اس موضوع پر محترم ڈاکٹر صاحب کا ایک گراں قدر مقالہ گذشتہ صفحات میں گزر چکا ہے ۔ ص ۔ ی

عورت ـــ اقبال کی نظر میں

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں
مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا کل آپ نے یہ صاف صاف
پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے

ـــــــ

یہ کوئی دن کی بات ہے اے مردِ ہوشمند
غیرت نہ تجھ میں ہو گی نہ زن اوٹ چاہے گی
آتا ہے اب وہ دَور کہ اولاد کے عوض
کونسل کی ممبری کے لئے ووٹ چاہے گی

ـــــــ

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا
گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب
پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند
اس راز کو عورت کی بصیرت ہی کرے فاش
مجبور ہیں معذور ہیں مردانِ خردمند
کیا چیز ہے آرائش و قیمت میں زیادہ
آزادیِ نسواں کہ زمرد کا گلوبند

ـــــــ

نے پردہ نہ تعلیم، نئی ہو کہ پُرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد
جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا
اس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

ـــــــ

قصور زن کا نہیں ہے کچھ اس خرابی میں
گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور
کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

(بانگ درا اور ضربِ کلیم سے اقتباسات)

عورت کی عفت وپاکیزگی کا مفہوم

اسلام میں عورت کو جس عفاف وپاکیزگی کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے۔ وہ اس کا زیور ہے، بلکہ یوں کہئے کہ وہی اس کی فطرت نسوانی کا حسن اور نکھار ہے۔

یہ یاد رہے کہ ہمارے ہاں عفاف وعصمت کے یہی معنی نہیں ہیں کہ کہ مصحف رخ پر ناپاک نگاہیں نہ پڑیں، بلکہ اس سے زیادہ اس کا مفہوم ایک طرح کی ایجابیت لئے ہوئے ہے اور ایک مخصوص طرح کی سیرت وکردار کا مظہر ہے۔

عفاف کے معنی یہ ہیں کہ ایک عورت یہ سمجھتی ہے کہ محبت وتعلق خاطر کے تمام حقوق صرف ایک شخص کو حاصل ہیں اور وہ میرا شوہر ہے۔ صرف اس کی نظریں میرے جمال وزیبائش کا جائزہ لے سکتی ہیں اور اسی کی محبت روح وقلب کی زندگی وبالیدگی کا باعث ہو سکتی ہے۔

اور آوارگی کے معنی صرف یہ نہیں کہ عورت بدکردار ہے، بلکہ اس سے زیادہ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ بدنصیب۔ محبت واخلاص کی اس دولت سے محروم ہے جو عائلی زندگی کی جان اور اساس ہے اور اگر معاشرہ اس بدکرداری کی حوصلہ افزائی کرتا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ گھروں کو ان فطری سعادتوں سے اور اخلاص وتودّد کی بے بہا نعمتوں سے محروم کر دینا چاہتا ہے اور یہی وہ نقطہ زوال ہے کہ جو قومیں بھی محرومی وبدبختی کی اس منزل تک پہنچیں، پھر وہ ایسی مٹیں اور اس طرح ختم ہوئیں کہ دوبارہ نہیں ابھر سکیں۔

(الاعتصام ۲ مارچ ۱۹۵۱ء از مولانا محمد حنیف ندوی مرحوم)

مظفر وارثی

اے دُخترِ اسلام ۔!

لگتی ہے کلی کتنی بھلی شاخِ چمن پر
ہاتھوں میں پہنچ کر کوئی قیمت نہیں رہتی
جو شمع سرِعام لٹاتی ہے اجالے
اس شمع کی گھر میں کوئی عزّت نہیں رہتی
تسلیم کہ پَردہ ہوا کرتا ہے نظر کا
نظروں میں بھی برداشت کی قوت نہیں رہتی
مردوں کے اگر شانہ بشانہ رہے عورت
کچھ اور ہی بن جاتی ہے عورت نہیں رہتی
جھانک اپنے گریبان میں کیا ہو گیا تجھ کو
حیرت سے تجھے تکتا ہے آئینۂ ایام

اے دخترِ اسلام

خود اپنی جڑوں پر ہی چلاتی ہے دراتنی
بربادئ احساس نمو مانگ رہی ہے
کب بخشی گئی ہیں تجھے آزادیاں اتنی
جو حق ہی نہیں ہے ترا تو مانگ رہی ہے
میں تو ترے ماتھے پہ پسینہ بھی نہ دیکھوں
مجھ سے مری غیرت کا لہو مانگ رہی ہے
جنت ہے ترے پاؤں میں فرمایا نبیؐ نے
دریا پہ کھڑی ہو کے سبُو مانگ رہی ہے
وہ رُتبہ عالی کوئی مذہب نہیں دیتا
کرتا ہے جو عورت کو عطا مذہبِ اسلام

اے دخترِ اسلام